جملہ حقوق محفوظ

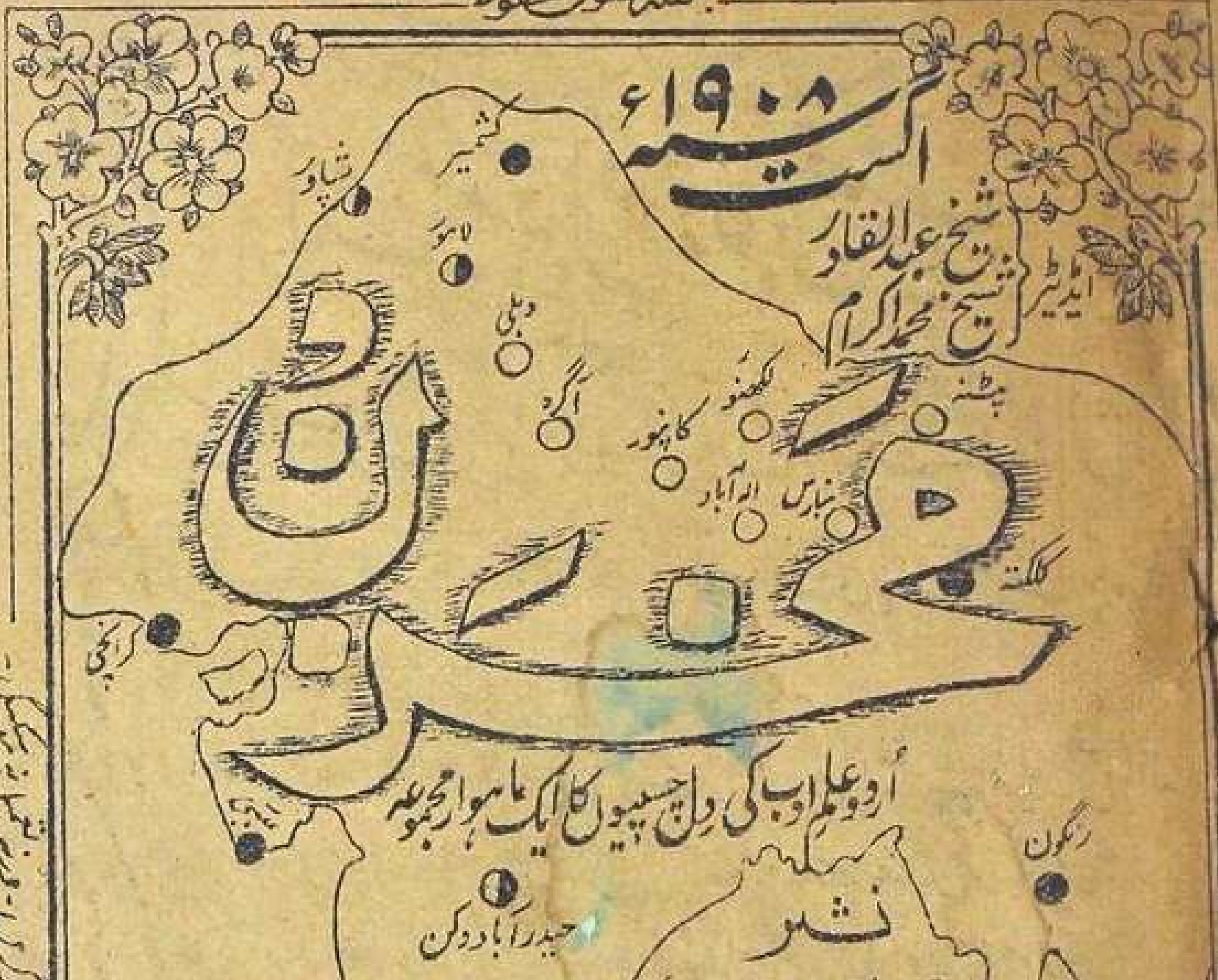

اگست سنہ ۱۹۰۸ء

ایڈیٹر شیخ عبد القادر
شیخ محمد اکرام

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

نثر

تصویر خاندان شریف

عوام ہند - حاجی موسیٰ خان صاحب مبین دتاولی جائنٹ سکرٹری مسلم لیگ ۱

قافلہ - مولوی سید مقبول احمد صاحب ... ۷

سودائے سنگین - سید سجاد حیدر صاحب بی - اے ... ۹

قوت بیانیہ کا زوال - نواب ... صاحب کانپور - ۲۱

مالوہ کی سیر - مولوی سعید احمد صاحب مارہروی - ۲۸

احباب ...... ا - ب - طیب - لاہور ۳۵

خاندان شریف - حافظ عبد القدیر صاحب دہلوی ۴۴

گستاخیں ٹلسی داس - مسٹر پیارے لعل شاکر میرٹھی - ۵۱

شیر و شکر - حافظ عبد القدوس صاحب قدسی

ریویوز ۶۱

نظم

ترانہ مسرت - سید غلام بھیک صاحب نیرنگ بی - اے ۶۲

جزیرہ سسلی - ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم - اے بی - ایچ - ڈی ۶۳

مقدم برشگال - منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی ۶۵

برسات - سید نذیر حسین صاحب شاد بی - اے ۶۶

عالم نزع - مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی ۶۷

تازہ غزلیں

دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ۔ ان شہروں میں اردو مروج ہے ۔ اردو سمجھی جاتی ہے -

باہتمام شیخ محمد اکرام مخزن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک قسم دوم

فی پرچہ ۳ؔ

اطلاع - [illegible]

ایک مفید عام قابلِ قدر و قابلِ دید تصنیف

کی نسبت

ہندوستان کے مشہور انگریزی و اردو اخبارات و رسالجات کے قیمتی اقوال

(۱) سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۲۳ - فروری سنہ [illegible]ء "مخزنِ حکمت جو طبِ خانگی پر ایک مفید تصنیف ہے ہر ایک تعلیم یافتہ ہندوستانی کے ہاتھ میں ہونی چاہیے"۔

(۲) ابزرور لاہور مورخہ ۲ - اکتوبر سنہ [illegible]ء "مخزنِ حکمت اپنی طرز کی ایک نہایت مفید اور بیش بہا تصنیف ہے - ہم اردو دان پبلک کو اس کی قدردانی کی بڑے زور سے سفارش کرتے ہیں"۔

(۳) ریویو آف ریلیجنز قادیان بابت اپریل سنہ [illegible]ء "مخزنِ حکمت اردو لٹریچر میں ایک بے نظیر اضافہ ہے - ہم عام [illegible]دو خوان حضرات کو اس کی قدردانی کی سفارش کرتے ہیں"۔

(۴) روزانہ پیسہ اخبار لاہور مورخہ ۲۷ ستمبر سنہ [illegible]ء "مخزنِ حکمت واقعی ایسی مفید کتاب ہے کہ ہر ایک گھر میں موجود ہونی چاہیے"۔

(۵) علیگڈہ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۲۲ - جنوری سنہ [illegible]ء "مخزنِ حکمت کو ہم علم طبِ خانگی کا ایک بے مثل خزانہ کہہ سکتے ہیں ہم کو امید ہے کہ یہ کتاب عام لوگوں کے لئے ہی مفید اور کارآمد ثابت نہیں ہوگی بلکہ خواص بھی جو قدیم اور جدید طب سے دلچسپی رکھتے ہیں - اس کو حسنِ قبول کے ہاتھوں پر لینگے"۔

(۶) الندوہ - لکھنؤ بابت جون سنہ [illegible]ء "مخزنِ حکمت طب اور الوپیتھی (ڈاکٹری) کی نہایت جامع کتاب ہے جس کے لئے ہندوستان کی طبی دنیا کو جناب شمس الاطباء کا مشکور ہونا چاہیے"۔

(۷) مجلہ طبیہ دہلی بابت نومبر سنہ [illegible]ء "مخزنِ حکمت طبِ یونانی و ڈاکٹری کا کارآمد ذخیرہ ہے - ہمیں پوری توقع ہے کہ ہندوستان کے ہر ایک گھر میں اس کی ایک جلد ہوگی"۔

حجم کتاب ۱۲۷۶ صفحات جنمیں بہت سی رنگین و سادہ تصاویر ہیں قیمت مجلد [illegible]

کتاب کے ملنے کا پتہ :- دفتر جناب شمس الاطباء - لاہور

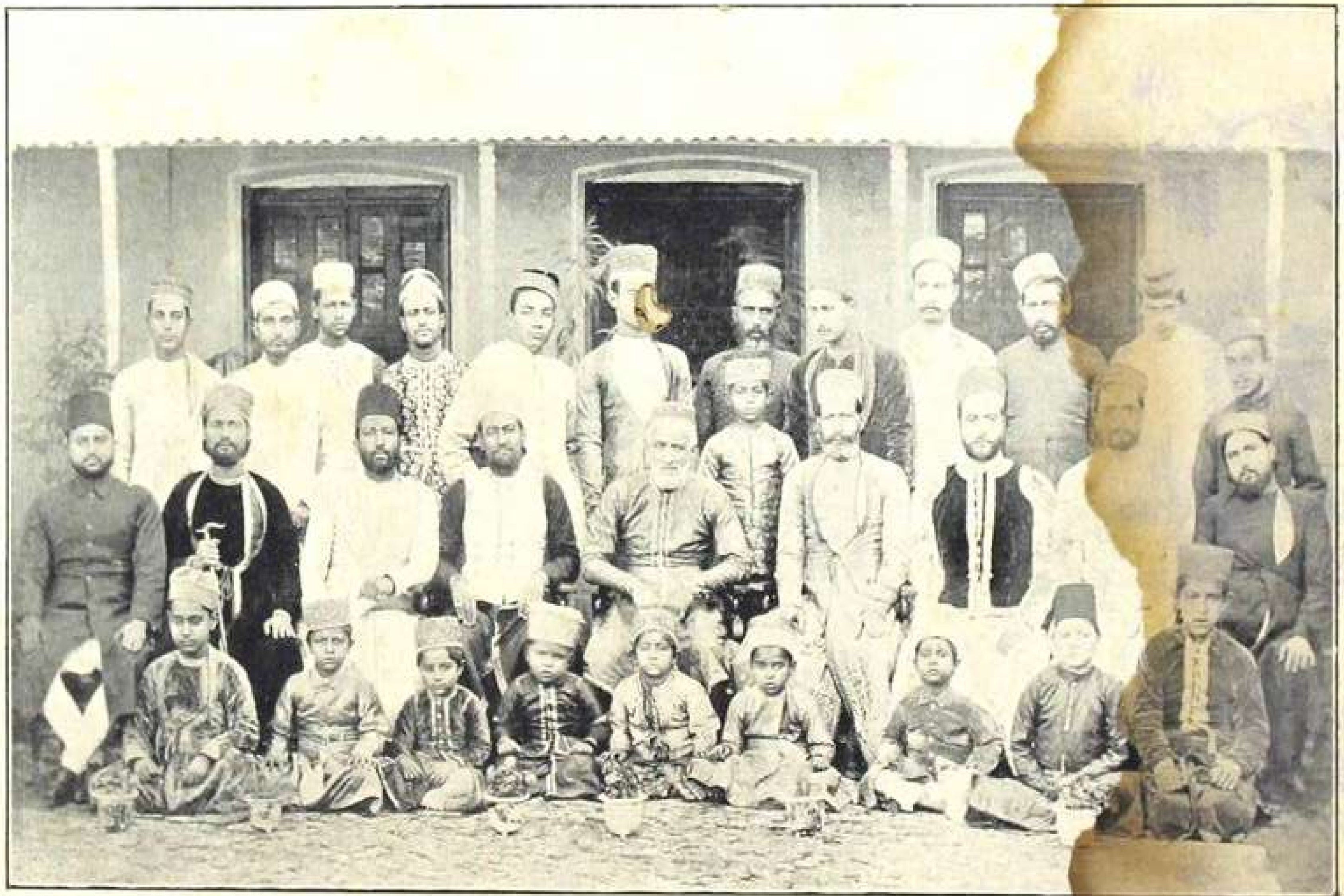

مخزن

عوامِ ہند

اور

اُن کی جانب سے غفلت

جبکہ عام طور پر دعوے کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں کشمیر سے راس کماری تک اور اودہ سے سندھ تک ایک وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اور اس جزیرہ نما کی ہر قوم اور ہر گروہ میں اعلےٰ تعلیم نے بیچینی پیدا کر دی ہے تو حیرت ہو گی اگر یہ کہا جائے کہ ہنوز ہمارے مصلحان ملک وطنی ترقی کی طرف سے غافل ہیں۔

ہم آمادہ نہیں ہیں کہ صرف اُس کو ترقی کے آثار اور مبارک بیداری کی نشاں کہیں کہ اِدھر اُدھر غل مچا دیا چند لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے کچھ تجویزیں پاس کر دیں اور بس ہماری رفتار ترقی کی جانب شروع ہو گئی۔ اتنے عظیم الشاں جزیرہ نما میں جس کو بجائے خود ایک برِ اعظم کہا جا سکتا ہے اور جس کی مردم شماری تیس کروڑ سے زاید ہے صرف چند ہزار آدمی ملکی ترقی کا ادعا کرنے لگیں حالانکہ اپنے پیارے وطن کی جانب سے وہ خود غافل ہیں اچھی بیداری نہیں کہی جا سکتی۔ جبتک کہ بیداری کے آثار ملک کے

ہر طبقہ میں پیدا نہ ہو جائیں۔ جبتک کہ ہر گروہ اپنے ملک کی جانب سے پورے طور پر واقف نہ ہو جائے جبتک کہ تمام باشندے اپنی پستی کو محسوس نہ کرنے لگیں اور جبتک کہ ادنے مزدور سے اعلے طبقہ کے لوگوں تک میں باہمی ہمدردی نہ پیدا ہو جائے اور پورے اتفاق سے ملکی ترقی میں کوشش نہ کرنے لگیں اُس وقت تک یہ دعوے نہیں کیا جا سکتا کہ ملک میں وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اور اہل ملک کی رفتار ترقی کی جانب ہے۔

ہندوستان چند صوبوں پر منقسم ہے صوبہ جات کمشنریوں سے مرکب ہیں کمشنری اضلاع سے اور اضلاع دیہات سے مرکب ہیں تا آنکہ صوبہ جات سے لیکر دیہات تک یکساں ہر فرد بشر کو ملکی ترقی کی فکر نہ پیدا ہو جائے اُس وقت تک ہم تو اُن کو "وسیع پیمانہ پر ملکی بیداری کے آثار" نہیں کہینگے۔ تم چھوٹے چھوٹے دیہات میں جاؤ اور وہاں کے نیم برہنہ باشندوں کی حالت دیکھکر جو ہندی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہے اُن غریبوں کو شائد یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ لفظ ترقی کس جانور کا نام ہے اور ملک کس چڑیا کو کہتے ہیں۔ اگر کسی دیہاتی سے دریافت کیا جائے تو زیادہ سے زیادہ وہ ملک کا اطلاق اپنے گرد نواح کے دس یا پانچ دیہات پر کریگا اور بس۔ اس دیہی آبادی کا سب سے بڑا بوجھ بھگتنے والا وہ ہوگا جو اُن دو دریاؤں کے نام سے واقف ہوگا۔ جنکے درمیان میں وہ قریہ واقع ہے، وہ جب کسی کی تعریف یا مذمت کریگا تو کہیگا "گنگا جمنا کے بیچ میں ایسا آدمی نہیں ہے"، جس ملک میں عام طور پر زبان زد ہو کہ "گنگا سے آگے ویسی نہیں ہے" اُس ملک کا "بلیغ معلومات معلوم۔ ہم ملکی مصلحوں سے دریافت کرتے ہیں کہ

انہوں نے اس کثیر آبادی کی اصلاح کی کیا کیا تدابیر اختیار کی ہیں، اُن کی تربیت کے واسطے کتنی انجمنیں بنائی ہیں کتنے دیہاتی فری اسکول جاری کئے ہیں۔ جنمیں قریہ جات کے باشندوں کی اولاد تعلیم حاصل کرے، کیا کیا ایسی تدابیر سوچی ہیں جن سے ان لوگوں کو نوشت و خواند کی جانب رغبت ہو اور کتنا ایسا کم قیمت لیٹریچر مہیا کیا ہے اور اخبار جاری کئے ہیں جنکے ذریعہ سے دیہاتی باشندوں کو دنیا کی حالت اپنے ملک کی حالت اور اپنے ادبار سے آگاہی حاصل ہو۔ اور آگے بڑہنے کا اُن کو خیال پیدا ہو جائے۔ تمہارے ان سوالوں کا جواب ضرور تم کو نفی میں ملیگا۔ جب یہ حالت ہے تو کسطرح کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں آپ ذرا ترقی یافتہ ممالک کی سیر کیجئے اور اٹلی ہی کو دیکھئے جو ترقی کے لحاظ سے یورپ میں کم درجہ پر سمجھا جاتا ہے۔ وہاں ہر جگہ آپ اخبارات کے کلب پائینگے اور کثرت سے سستا لٹریچر آپ کو وہاں نظر آئیگا جسکو ادنے سے ادنے باشندۂ ملک خرید سکے اور اس کے ذریعہ سے اپنی واقفیت بڑہا سکے، تم کوئی مزدور کوئی گاڑی بان اور کوئی خدمتگار ایسا کم دیکھو گے جو ذرا فرصت ملنے پر اس سلسلۂ لٹریچر سے فائدہ نہ اُٹھاتا ہو۔ آپ انگلستان جائیے اور کسی پورٹروں یا گاڑی بانوں کے کلب کو دیکھئے اور ملاحظہ کیجئے کہ وہ مزدور جو ابھی ایک شلنگ مزدوری لیکر آپکا گلیڈ اسٹن بیگ دو فرلانگ تک لے گیا ہے۔ کس درجہ کی مضبوط دلائل کے ساتھ گورنمنٹ کی پالسی پر نکتہ چینی کرتا ہے اور اپنی قوم اور سلطنت اور ملک سے اُس کو کس قدر واقفیت حاصل ہے۔ آپ دیکھئے کہ یورپ میں اُن کی ہم قوموں نے اپنے ادنے درجہ کے ہم قوموں کی تعلیم اور واقفیت

بڑھانے کا کیسا انتظام کر رکھا ہے - وہاں کی ادنےٰ آبادی کے واسطے
جداگانہ سکول ہیں جداگانہ کلب ہیں جداگانہ لائبریریاں ہیں اور جداگانہ
سلسلے اخبارات کے ہیں اس حالت پر بھی وہ لوگ مطمئن نہیں ہیں اور ابھی
تک ذرایع ترقی کی تلاش میں مصروف ہیں - یہ کہا جائیگا کہ یورپ میں
تعلیم جبری ہے مگر ہم اُس کا یہ جواب دے سکتے ہیں - کہ وہاں جبری تعلیم
تب ہی ہوئی جبکہ ملک میں تعلیم کی جانب عام فیلنگ پیدا ہو گیا ہم دریافت
کرینگے کہ دیہی آبادی میں ایسا فیلنگ پیدا کرنے کی کس قدر کوشش کی
جاتی ہے اور کتنے ہمارے لکچرار صاحبوں نے اپنے کو وقف کر رکھا ہے
کہ چھوٹے چھوٹے دیہات میں جاکر اپنے برادرانِ وطن کو تلقین کرینگے
اور تعلیم کی جانب اُن کو مائل کرینگے - شہروں اور قصبوں میں لکچر بازی کرنا
اور ایسے اخبارات میں مضامین لکھنا جنسے تمہاری آبادی کا عظیم الشان حصہ
بالکل ناواقف ہے ملکی ترقی کے واسطے ہرگز کافی نہیں کہا جا سکتا +

ہماری آبادی کا یہ ادنےٰ ترین حصہ جنکی طرف سے ہم اس درجہ غافل
ہیں اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو ملک کا تمام دار مدار اور انتظام اسی ادنیٰ
آبادی کے ہاتھوں میں ہے - یہان نیم برہنہ کاشتکار اپنے خون پانی کی محنت
سے زمین سے پیداوار کی کوشش کرتے ہیں - اور اس ذریعہ سے سلطنت
کے خزانہ میں کروڑہا روپیہ داخل ہوتا ہے - انہی چھوٹے لوگوں میں اگر کوئی
شخص تھوڑا بہت لکھ پڑھ جاتا ہے - تو ضروری چھوٹے چھوٹے امتحانات
دیکر گورنمنٹ کی جانب سے کسی گاؤں کی نگرانی اُس کی سپرد ہو جاتی ہے
جس کی زیادہ سے زیادہ دس پندرہ روپیہ ماہوار تنخواہ ہوتی ہے - یہی ایک
شخص ہے جس کے قبضہ میں ملک کی مالی حالت دکھانا ہے کہ جس طرح چاہے

اُس کو ظاہر کرے ملک کی مزروعہ یا غیر مزروعہ رقبہ کے اعداد اگر خدانخواستہ قحط ہو تو اُس کے اعداد اپنے قریہ سے یہی بنا کر افسران بالا کو بھیجتا ہے جن سے بڑے بڑے نقشہ جات مرتب کئے جاتے ہیں حکام کی طلبداشت پر یہی چھوٹا سا اہلکار ضروری معلومات مہیا کرتا ہے غرض اگر غور کیجیے تو ہماری نظر سے قریہ سے لیکر گورنمنٹ آف انڈیا تک ایسی ایک چھوٹے سے اہلکار کا ظہورا ہے مگر ملک کا ایسا اہم اور ضروری جزو اگر اُس کی معلومات کی تحقیقات کی جائے تو کمشنری سے آگے نہیں بڑھتی اور ملکی حالت اور اُس کی ترقی یا تنزل کو نہ تو یہ شخص سمجھتا ہے اور نہ اُس کو اُس سے دلچسپی کیا ایسے شخص سے یہ امید کیجا سکتی ہے کہ گورنمنٹ کو معلومات مہیا کرتے وقت وہ ملکی حالت کا پوری ایمانداری کے ساتھ لحاظ کریگا اور جبکہ یہ کیفیت ہے تو کیا ہمارا یہ دعوے کہ ملک میں وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں ٹھیک ہو سکتا ہے +

ہمارے ہندوستان کے تو خمیر میں داخل ہے کہ باشندوں کی حیثیت میں فرق کیا جائے - یہاں اصولاً اہل ملک کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور غریب شودر صرف اس گناہ کی عوض کے وہ کم حیثیت گھر میں کیوں پیدا ہوا اس قابل بھی نہیں سمجھا جاتا کہ برہمن کے ہم حیثیت ہونے کا دعوے کرے - گو مسلمانوں کے اصول میں داخل تھا کہ وہ تمام بنی نوع انسان کو برابر سمجھیں اُن کے قرآن میں صاف کہا گیا تھا کُلّ مؤمنٍ اِخوۃ مگر ہندوستان میں آکر تفریق کا مرض اُن کو بھی چمٹ گیا اور مساوات کا مبارک اصول اُن سے بھی اُٹھ گیا - جس ملک میں صدیوں کی مسلسل حقارت سے ایک عظیم الشان حصہ آبادی اپنے کو پست سمجھنے لگے اور ذہن نشین کر لے کہ ہم اُن سے

زیادہ بڑھ ہی نہیں سکتے اور اس ملک کے مصلح اس گروہ کی جانب سے قطعاً غافل ہوں پھر کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ اُس ملک کی رفتار ترقی کی جانب ہے - آپ یورپ میں دیکھیں جہاں ایک چرواہا اور ایکمنے دور سمجھتا ہے کہ اگر وہ کوشش کریگا تو جیمس واٹسن اور کیئر ہاروی ہوسکتا ہے اور جہاں مساوات کا اس قدر خیال ہے کہ اگر سیاہ ٹوپی مروج ہوگی تو ہر ایک سر پر آپ سیاہ ہی ٹوپی دیکھیں گے خواہ وہ مسٹر اسکوئتھ کا ہو یا ایک مزدور کا - یہ علامات ہیں جن سے کسی ملک کو "وسیع بیدار" یا مائل ترقی کہا جاسکتا ہے - جبتک کہ ملک میں زور شور سے مساوات کے خیالات پیدا نہ ہو جائینگے، جبتک کہ ہر ایک ہندوستانی دوسرے کو مساوی نہ سمجھنے لگیگا، جبتک کہ نیچے کے درجہ کے لوگوں کی اصلاح کی جانب مصلحان ملک کی توجہ نہ مائل ہوگی اور شودروں تک کے خیالات میں یہ بات پیدا نہ کیجائیگی کہ ہم لوگ بھی برہمن ہی کی مثل حقوق حاصل کر سکتے ہیں - اس وقت تک یہ دعوےٰ کرنا "کہ ملک میں وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں" اور "ملک کی رفتار ترقی کی جانب ہے" بہت قبل از وقت ہے +

حاجی محمد موسیٰ خان علیگڑھ

امید وہ جوہر ہے جس کے بل پر دکھیا اور مصیبت زدہ اپنی زندگی کے دن کاٹتے ہیں - امید طوفان میں روح کا لنگر بنتی ہے اور مشک کی طرح سہارا دیکر انسان کو مایوسی کے گہرے پانی میں ڈوبنے سے بچاتی ہے اور جب موت کنڈی کھڑکھڑاتی ہو اس وقت بھی آدمی کی ہمت بندھا کر اُسے زندہ رکھتی ہے +

قافلہ

شیوۂ رندان بے پرواخرام از من مپرس
این قدر دانم کہ دشوار است آسان زیستن

اللہ اللہ اس خاک پاک امریکہ کا کیا کہنا - اس سرزمین سے جو اُٹھتا ہے فرزانہ و نو آہنگ - آزادہ روی و نازک اندیشی میں یکتا "پرانی دنیا" اگر جدت پرست تھی تو "نئی دنیا" جدت پرستی کی سب سے اچھی مثال لاسکتی ہے - برازیل کا عربی اخبار المنار جو خاص پایہ تخت جمہوریہ سے شایع ہوتا ہے ناقل ہے کہ قافلہ کے نام سے وہاں جنوبی امریکہ میں جدید تحریک ہو کر ایک جماعت قایم ہوئی ہے جس نے عرب کی رسم و رواج پارینہ کا احیا اپنے ذمہ لازم کرلیا ہے - اس زندہ دل انجمن کے معینہ اوقات پر جلسے ہوتے ہیں اور یاران ہمدم باہم مل جل کر وہی مدارات و تواضع برتتے ہیں جو اہل عرب کا قدیم سے شیوہ ہے - وہی انداز وہی اخلاق وہی مراسم اختیار کیے گئے ہیں جو اس طیلسان پوش قوم کے مایۂ ناز رہے ہیں +

اس شہر کے اکثر مشہور انشا پرداز اور نامور اہل قلم اس سلسلہ میں داخل ہیں جن کا مقصود اصلی نہ صرف تفکہ و ظرافت طبع ہے بلکہ روح عربیت کا پھونکنا یہی وجہ "قافلہ" نام رکھنے کی ہے - اسکی مقدمۃ الجیش یا سرگرم کارکن کوالیونتو اور آوٹو لافو بیلاک ہیں - پہلا اگر شیوا بیانی و سحر طرازی میں مشاق زباندانی و علم لغت میں یگانہ ہے تو دوسرا بھی اخلاق نگاری و تہذیب آموزی میں نظیر نہیں رکھتا - اس مجلس کا ایک کارنامہ ہماری نگاہ سے بھی گذرا جس کو دیکھکر عجب لطف و سرور حاصل ہوا - روح عربیت نے اپنی جھلک دکھا دی - تنہا مزے لینا

مروّت و محبت کے خلاف سمجھ کر احباب صافی مذاق کی تفریح و تفنن کے لئے اُس کا اعادہ کیا جاتا ہے +

ہر شخص جو اس جماعت میں شامل ہو "بدوی" کہلاتا ہے اور اُس کو اس سوسائٹی کی صحبتوں میں اُسی بادیہ نشین و صحرانورد گروہ کا طریقہ انجام دینا ہوتا ہے۔ پچھلی مرتبہ ان جمعیت کا تیسرا عشا (ڈنر) اوتل غلوبو (گلوب ہوٹل) میں دیا گیا تھا۔ سو بدوی شریک تھے منتظم و سربزم اولافو بیلاک خود تھا۔ مٹی اور ٹھیکریوں کے ڈھیر سے اونٹ بنا کر ان کی پشتوں پر نہایت خوش سلیقگی سے مائدہ (میزوں) کی آرائش و تزئین بنفشہ کی غنچوں سے کی گئی تھی۔ جس سے خوانہائے نعمت و عطایائے قدرت کی رونق و شان دوبالا ہو گئی تھی۔ ہر مہمان کے روبرو پیالے کے پیچھے ایک ایک سربمہر لفافہ بھی رکھا ہوا تھا۔ لفافے کھولے گئے تو اونمیں سے لائحہ طعام (مینو) نکلا۔ پر تکلف ورق پر بزرگ کو آلیونتو کی تصویر نمایاں تھی بدوؤں کے لباس میں ایک اونٹ کی نکیل تھامے ہوئے۔ پھر یہ عبارت تحریر تھی +

مقامہ سوم۔ زیر سایہ شبستان غلوبو۔ ماہ رمضان کی تیسری مبارک شب ۱۳۲۵ھ (۱۵ ار اکتوبر ۱۹۰۷ء) +

شوربہ بلخ ہای بجذ۔ ماہئی قلزم احمر کے کباب جو ریگ لیبیا پر سفیہائے نہنگ سے بریاں کی گئی شتر سفید کم عمر کی ران بحیرۂ شاد (چاڈ) کے ساحل سے چھنتی والے شتر مرغ صنعا، کی ساگ و ترکاریاں جو ہیکل جوپیٹر کے ویرانہ کے حوالی سے لیگئی ہیں۔ ایک یمنی میوہ - شیر ناقہ کا پنیر۔ بادۂ بت پرستاں جسکا ایک جام بے تامل پی لینا واجب بلکہ لازم ہے +

اے اہل ارض رنگ ہمارا اُڑا ایو
تقلید میں بھی تاکہ ہو ایجاد کا مزا
(مقبول)

سودائے سنگین

فرامرز مرزبان جمشید جی سے، بمبئی کے قلابہ اسٹیشن پر اتفاقاً ملاقات ہوئی اور اس ملاقات نے مجھے بہت حیرت میں ڈالا سال بھر سے میں نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ اس عرصہ میں، اسمیں کسقدر تغیر ہوگیا تھا! اُس وقت، اُس کے ہلکے چہرے کے اداس رنگ پر مسرتِ شباب کا غازۂ گلگوں پھرا ہوا تھا؛ آج ایک انجماد عنبریں ایک سانولے پن کے ساتھ ساتھ چہرہ پیلا پڑگیا تھا۔ اُسکی ہلکی سُرخی مائل مونچھوں میں - جنہیں اُس وقت وہ کاسمیٹک لگا لگا کے فوجی ڈھنگ پر سیدھی اور نوکدار بنایا کرتا تھا، اور جنسے اُس کے چہرے کی زنانہ ملاحت پر ایک مردانہ وقار پیدا ہو جاتا تھا۔ آج ایک پریشانی تھی، اور اضطراب کی تکلیف دہ کیفیت کیساتھ کھلے ہوئے ہونٹوں پر ایک تھکن برس رہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نوجوان پر بھی جو ہمیشہ بنے سنورے رہنے کے لئے مشہور تھا زندگی کی کسالت غم چھا گئی تھی - میں سمجھتا تھا کہ یہ مجھے دیکھ کے خوش ہوگا۔ برخلاف اس کے میں نے دیکھا کہ اس اتفاقیہ ملاقات سے جسمیں اُسے مجھسے بات کرنی پڑیگی، وہ بیزار معلوم ہوتا تھا۔ ذرا سا ہٹ کے میرے بیٹھنے کے لئے اس نے بنچ پر جگہ دی؛ اس لئے کہ قواعد اخلاق کی مخالفت صریح نہو، اُسکے پتلے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پیدا ہوئی مگر پیدا ہوتے ہی مرگئی۔

یہ پُر اجتناب طرز قبول ایسا نہ تھی کہ مجھے اس بات کی ہمت دلاتی کہ میں

اپنی پرانی عادت کے موافق "تم" سے اُسے خطاب کرتا، اسلیئے میں نے کہا:

"مدتیں ہوئیں آپ سے تو ملاقات ہی نہیں ہوتی۔"

"ہاں" کہا اور یہ کہکے اپنی بائیں کہنی کو بنچ کے ہتے پر ٹیک کے بیٹھ گیا، نگاہ نیچے پتھروں پر گاڑ دی، اور سگرٹ کی راکھ گرانے کے لیئے سگرٹ پر اپنی انگلی آہستہ آہستہ مارنے لگا۔

نگاہ تو اس کام پر، مگر خیال کہیں اور، اس حالت میں اُسنے اپنا فقرہ جاری رکھا:

"ہاں، پچھلے سال اُس واقعہ کے بعد، میں والدہ کی ساتھ بمبئی آیا تھا، اُس وقت سے ابتک بندورہ میں ہیں، کبھی یہاں آتے ہی نہیں، آج کا آنا مستثنےٰ سمجھنا۔"

کس واقعہ کا مجھ سے ذکر کر رہا تھا؟

ٹوٹے ٹوٹے فقرے کہتا تھا، آنکھیں سگرٹ سے نہ ہٹاتا تھا۔ پھر گویا اس بات سے متعجب ہوکر کہ ایک ہی دفعہ اس قدر باتیں کر گیا، وہ یکایک اپنے فقرے کو تمام کیئے بغیر رُک گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ نوجوان جسکی تمام گذشتہ زندگی مجھے معلوم تھی، یاس کی ہوائے گراں سے بیتاب ہے۔

یہ نوجوان جو ہمیشہ متبسم وظریف رہتا تھا یہانتک کہ اپنے آلام عاشقانہ میں بھی کوئی ایسی حکایت ضرور کہتا جو تمہیں خوش کرتی، اپنی سب سے زیادہ یاس انگیز حسیات وکیفیات کی رقیق اور پُرتاثیر زبان سے تصویر کھینچتے ہوئے، یہ دیکھکر کہ اُس کی سرگذشت تمہارے دل میں رقت پیدا کرنے کو ہے، ایک نہایت ہی چھوٹا سا لطیفہ اپنی سرگذشت میں غیر معلوم طریقہ سے داخل کرکے، تمہارے مونہہ سے ضرور ہی قہقہہ نکال لیتا، غرضکہ یہ ہمیشہ لطیف وشوخ، ہمیشہ متاثر، لیکن ساتھ ہی ہمیشہ ہنسنے ہنسانے کے

بہانے ڈھونڈھنے والا نوجوان، اسوقت کے اکھڑے اکھڑے رنجیدہ خیالات میں مستغرق نوجوان سے اس قدر دُور نظر آتا تھا کہ .....

فرامرز کو میں برسوں سے جانتا تھا۔ یہ اک شاعر تھا، حساّ و فکراً شاعر اگرچہ لساناً نہ ہو۔ اپنی تمام ہیئت معتوبہ کے ساتھ شاعر تھا کہ زندگی کو نورِ شعر میں دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ اُن بدبختوں میں سے تھا جو زندگی کی مادّیات کے تھپیڑوں کے کھانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں حالانکہ اُن کا خستہ و مجروح اور ہائے ستم! شاعرانہ دل مثل ایک مریض بچے کے اُن تھپیڑوں کے کھانے کی طاقت نہیں رکھتا .... مگر اس کی طبیعت میں ایک میلان نشوۂ تھا کہ سب سے زیادہ مکدر زمانے میں اپنے پُر ملال چہرے پر اک مسکراہٹ ضرور رکھتا تھا۔ اس تبسم سے میں یہ سمجھتا تھا کہ اسے زندگی کی مادّیات سے جب پالا پڑتا ہے تو اُن کے یقین نہ کرنے میں ثبات قدم رہنا چاہتا ہے اور اس طرح اپنے تئیں دھوکا دیتا ہے۔ خود کہا بھی یہی کرتا تھا: "زندگی میں سے موسیقی اور شعر، پھول اور روشنی، اور پھر ان سب کا مجموعہ ان سب کا حاصل عورت کو نکال ڈالو، پھر دیکھیں کیونکر دنیا میں زندہ رہنے کی قوت اپنے میں پاتے ہو؟"

اگر زندگی انہیں چیزوں سے عبارت ہوتی اور اُن کی حقیقت بھی صرف تخیل سے مرکب ہوتی تو ہم سب کتنے خوش قسمت ہوتے۔ مگر یہ رنگین چیزیں ہوا ہیں اور رنگ، کہ اُڑ جاتی ہیں غائب ہو جاتی ہیں اور یہ عورتیں؟ کتاب حیات کی اس جلد کو ایک جلد زر اندود کی شکل میں دُور ہی سے دیکھتا تھا۔ اُسے پڑھنے، اس کے بابوں اور صفحوں کو جو آنسوؤں سے لکھے گئے ہیں! ابھی دیکھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ابھی اُسے یہ حقیقت

معلوم نہیں ہوئی تھی، کہ زندگی میں شعر، ایک نوحۂ ماتم، موسیقی، اک فغان یاس، پھول، ایک منجمد قطرۂ گریہ، روشنی، اک امید گریزاں کے علاوہ اور کچھ نہیں اور ابھی اُسنے یہ نہیں معلوم کیا تھا کہ عورت بھی اُس سراب کی مانند ہے کہ ڈھونڈھو مگر نہیں ملتا، دکھائی دیتا معلوم ہوتا ہے مگر ہاتھ نہیں آتا۔ پہلے اُس سے ہفتہ میں اک دفعہ تو ضرور ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ملاقات کا زمانہ گذرے ہوئے زمانے کی تلافی کر دینے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ اس ملاقات میں، اپنی زندگی کے ـ اپنی عاشقانہ زندگی کے، وہ کوئی دوسری زندگی سے واقف ہی نہ تھا ـ تمام صفحوں کو مجھے دکھاتا سات آٹھ مصرعوں میں اس ملاقات اور پچھلی ملاقات کے درمیان کے زمانہ کی تاریخ سنا دیتا۔ کبھی ایک لفظ ہی ایک ہفتہ کی رپورٹ سنانے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ یہانتک کہ بعض مرتبہ بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ مجھے دیکھکر اُس کا خوش خوش مسکرانا یا مُنہ بنانا مجھے کل حال بتا دیتا تھا۔

یہ راز کہنا اور سُننا، کس طرح اور خاصکر کس لئے شروع ہوا تھا؟ مجھے یاد پڑتا ہے، کہ مجھے اپنا رازدار بنانے کی عادت کی ابتدا اُس نے اس طرح کی تھی:

ایک دن صبح ـ آج کی ٹُلّایہ سٹیشن کی ملاقات سے پانچ سال قبل ـ اپالو بندر پر میں نے اُسے دیکھا۔ اپالو بندر پر صبح کے وقت اُس کا ہونا، اُس وقت کی زندگی کے لحاظ سے ذرا عجیب شے تھی ـ مجھے دیکھتے ہی مجھے اُسکی وجہ بتائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دن اُس کی طبیعت میں باتیں کرنے کا بہت جوش تھا، اور چونکہ اسے ایک ایسا آدمی مل گیا تھا جس سے وہ دل بھر کے باتیں کرسکتا تھا، اس لئے وہ خوش معلوم ہوتا تھا۔ مجھسے کہنے لگا:

بھائی کیا اچھا ہوا تم مل گئے، تم سے مشورہ کرونگا۔ مجھے ایک شادی کے لئے ایک ہدیہ تیار کرنے کی ضرورت ہے (کہتے وقت ہنسنے اور اپنے تئیں بے پرواظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا) ہمارے عزیزوں میں سے ایک لڑکی بیاہی جانے والی ہے۔ اس کے مناسب ایک ہدیہ تیار کرنے کے لئے میں نے کس قدر اپنی طبیعت پر زور ڈالا، اور انتخاب کرنے تک کن مشکلوں کا سامنا ہوا۔ پہلے میں نے چاہا کہ کوئی جڑاؤ زیوروں مثلاً ایک فیروزہ یا عقیق کی انگوٹھی یا ایک ننھی سی، سونے کی سینے پر لگائی جانے والی گھڑی۔ مگر میں نے اس خیال کو چھوڑ دیا۔ کیوں کہ ان چیزوں کے دینے میں کوئی نزاکت طبع ظاہر نہیں ہوتی ان چیزوں کے دینے کے یہ معنے ہوتے کہ میں اُس کے مذاق پر تحکمانہ اثر ڈالنا چاہتا ہوں۔ "ایسی انگوٹھی پہنو، ویسی گھڑی لگاؤ" کے قبیل سے اسپر ایک دباؤ ڈالنا ہوا۔ اس کے علاوہ اس میں ایک خواہش نمائش بھی تو ملی ہوتی، گویا میں میری چیز وہ ایک ہی بات ہے، اس کی انگلیوں میں، اس کے سینے پر نظر آؤں۔ سچ پوچھو تو اس میں ایک گنوارپن کا پہلو بھی تو نکلتا ہے۔ ہے نا؟ یہ ایسا ہی ہے جیسا ایک تحفہ دینا جس کی قیمت بھی اسپر کھدی ہو۔ یہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتیں، دیکھنے والے آنکتے اس انگوٹھی کی لاگت پچاس روپیہ کی ہوگی، یہ گھڑی ڈیڑھ سو کی ہوگی۔"

یہ فرامرز جمشیدجی، جو اسدن اپولو بندر میں کھڑا، کبھی اس پاؤں پر زور دے کے، کبھی اس پاؤں پر، اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کو نہایت وضاحت سے بیان کر رہا تھا، اور فلسفۂ ہدایا پر لکچر دے رہا تھا، پانچ سال بعد اس بڈھے نوجوان سے کتنا الگ کس قدر دور نظر آتا تھا جو سر نیچا کئے،

رنجیدہ شکل میں سگرٹ کی راکھ گرا رہا تھا اور مجھسے آنکھیں نہ ملانی چاہتا تھا۔

غرضیکہ اُسدن فلسفۂ ہدایا پر لکچر دیتے ہوئے کہہ رہا تھا:

"میں نے پھر ایک اور چیز سوچی، انگریزی اور ہندوستانی مٹھائیوں کا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی جمل سکیں، تاج محل ہوٹل کی مٹھائیاں، خونڈانٹ وغیرہ کا ایک خوان بھیجوں۔ مگر ان کی صرف ایک دو دن کی زندگی ہوتی میں چاہتا تھا کہ .... فرامرز کی اصلی تمنا میں ان تمام باتوں سے سمجھ رہا تھا۔ اس کا بلالزم، مجھے اسقدر سمجھانا، ایک شادی کے تحفہ کے لئے اس قدر تفصیلات بیان کرنا، ان باتوں میں جو وہ بیان کر رہا تھا، وہ مطالب جو وہ بیان نہیں کر رہا صاف جھلک رہے تھے۔

کہنے لگا: "آخر کار انتخاب کر ہی لیا۔ آؤ دکھاؤں" یہ کہتا ہوا مجھے گھسیٹ کر مارکس اینڈ کمپنی جوہریوں کے ہاں لے گیا۔ وہاں ایک کمرے میں لیجاکر، بیچنے والے سے پوچھنے لگا: سنگاردان تیار ہوگیا؟"

سنگاردان تیار ہوچکا تھا۔ وہ لایا گیا۔ یہ چاندی کا، (جسپر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا) ایک جڑاؤ سنگاردان تھا، جو ایسی نزاکت و نفاست سے بنایا گیا تھا، کہ بنانے والے نے اپنی حسن طبیعت کو ایک ایک خط میں صرف کیا تھا۔ ڈھکنے پر چاندی کے مجسم پھول اور پھل۔ مثلاً سیب اور نارنگی کے پھل اور گلاب کے پھول بنے ہوئے تھے، انمیں جا بجا موتی ٹکے ہوئے تھے، اندر کے خانے، نوِنڈر اور عطروں کی شیشیوں، اور قیمتی صابونوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کے اوپر ایک چاندی کی کشتی تھی جسمیں مخمل بچھی ہوئی تھی۔

کہنے لگا: "میں نے اس کو بنوایا۔ اس میں عطر ہونگے، عطر میں بسے ہوئے رومال ہونگے سنگار کی چیزیں ہونگی، خوشبوئیں ہونگی۔ اُبٹنے ہونگے پوڈر ہونگے،

وہ چیزیں ہونگی جو اُسکے مشامِ خیال میں، برسوں تک کسی وقت بہار زندگی کی خوشبوئیں پہونچائینگی .....

غرضیکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تئیں بھول گیا تھا، اور مجھے اپنا رازدار سمجھکے باتیں کر رہا تھا۔ یہانتک مجھے یہ سمجھانے لگا کہ اس تحفہ کو کیوں انتخاب کیا۔ وہ باتیں جو اس کے قلب میں بھری پڑی تھیں، کسی کو سُنا کر خالی کرنا چاہتا تھا۔ شاید اُس دن میں نہ ہوتا اُسے کوئی دوسرا ملتا، اُسی سے یہ سب باتیں کہتا:

"سمجھتے ہو؟ اس تحفے کے مطلب، اس ہدیے کے ماخذ، اس کی روح کو پورے طور پر محسوس کرتے ہو؟ اس طرح میں اسکے کپڑوں تک میں حلول کر جاؤں گا، یہ چیزیں اُس تک ایک لوئے آل پہونچائینگی، اس کے خوابِ نوشین میں بھی میری کوئی چیز ہوگی، میں اس کے نہانے کے پانی تک میں نفوذ کر جاؤنگا، اُٹھنا ملکے، جب اپنی ہتھیلیوں میں چلو بھر بھر کے پانی لے گی، تو اُس کی پتلی اُنگلیوں کے بیچ میں سے آبشار مسرت بن بن کے، اُسے ایک لطیف اور معطر ٹھنڈک کی بہار دونگا۔ اور جب وہ نہا کے تولیہ سے بدن ملیگی تو اُس کے مونھ، اُس کی گردن اُس کے کندھوں سے، گویا میری روح کا ایک نفس خیال ایک غبار صاف و سفید بنکر، ایک معطر بوسہ پران کی طرح اُڑے گا۔ اُس کے بعد اپنے رومال کو وہ لونڈر کے دو قطروں سے ملیگی، اور جب وہ اُسے سونگھیگی تو گویا میں اُس کی تمام اعماق روح میں پہونچ جاؤنگا ....."

یہانتک پہونچ کے اُس نے یکایک معلوم کیا کہ وہ ضرورت سے زیادہ کہہ گیا اور وہاں تک بڑھ گیا کہ اب واپس ہونا ممکن نہیں، یہ دیکھکے اُس نے

میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے، اور اپنے تمام اضطراب قلب کو ایک چھوٹی سی آہ میں قید کر کے کہنے لگا: "آہ! اس قصہ کو میں تمہیں کسی اور دن سناؤنگا"

غرضیکہ فرامرز نے مجھسے اپنے فسانۂ دل کا کہنا اس طرح شروع کیا تھا؛ اوّل اوّل ہماری ملاقات محض ادبیات کے جلسے ہوا کرتے تھے، وہ بھی فارسی ادبیات کا عاشق، الفنسٹن کالج سے فارسی میں آنرز کا گریجوایٹ ہیں فارسی ادبیات کا دلدادہ، وہ قاآنی کے قصیدے اور پروفیسر مرزا حیرت اور حافظ کی غزلیں سُناتا، سُناتا، فسانۂ دل سُنانے لگا۔ اُس دن کے بعد ہر ملاقات میں اس فسانۂ دل کے باب بڑھنے لگے، یہانتک کہ میں اُس کی تمام سرگذشت حیات سے واقف ہوگیا۔ گویا اُس کی عاشقانہ زندگی، ایسی زندگی تھی کہ میں بھی اُسمیں شریک تھا، اور ہم دونوں مل کے اُس زندگی کو بسر کر رہے تھے۔ اُسوقت میں نے یہ قطعی رائے اپنے دل میں قرار دے رکھی تھی کہ وہ فرامرز کا یہ عشق، اوّل اور آخری عشق ہوگا لیکن وہ اسے قبول نہ کرنا چاہتا تھا، اگر اُس کے ادعا پر اعتبار کیا جاتا تو یہ عشق محض ایک بچپن تھا، ایک لڑکپن کا کھیل کہ معلوم نہیں کب سے شروع ہوا، مگر شروع ہو کے جاری رہا۔ اس کے متعلق جو ایسے باتیں یاد تھیں ہنس ہنس کے (گویا انہیں اہمیت نہ دینی چاہتا) بیان کرتا اور بیان کرتے وقت اس لڑکپن پر تعجب کرتا نظر آتا تھا، لیکن نہ معلوم کیوں، ایک تاثیر عمیق، اس ہنسی اس خندۂ استہزا کے پردے کو چیر کے، نوجوان آدمی کے دل میں ایک غیر قابل شفا زخم کو ظاہر کرتی تھی جو اس عشق سے پڑ گیا تھا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ عشق کیا تھا، مذاق تھا، وہ کہتا: "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس تمام دور میں عشق

بیاہ کرنا، یا سادہ عشق و محبت کی حد سے آگے بڑھنا، یا بڑھنے کی جرأت کرنا، ہم دونوں کے خیال میں بھی نہیں آتا تھا۔ ہم بس سادہ ایک دوسرے کو چاہنا، یا یہ خیال کرنا چاہتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے عاشق ہیں گویا ہم دونوں نے ایک وقت مقررہ کے لئے حسن و عشق کا ایک مضحک ناٹک کھیلنے کا ارادہ کیا تھا، اور ہم دونوں ایکٹر تھے۔ پردہ گرتا، تماشہ ختم ہوتا، اور ہم دونوں ایک دوسرے سے نہایت خوشی سے ہاتھ ملاتے، اور ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرتے کہ خوب پارٹ کیا، اور اس تماشے کو جسے ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا، وہیں چھوڑ کے، ہر اک اُس راستے پر پڑ لیتا جو ہمارا طابع معیشت ہمارے لئے ہمیں بتاتا۔ ہم دونوں اسے جانتے تھے، اور اس کے متعلق گفتگو کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ وہ اکثر اپنی شادی کے متعلق اپنے تصورات مجھسے بیان کیا کرتا، جن گھرانوں سے اُس کے لئے پیغام آتے اُن کے متعلق مجھ سے رائے پوچھتا، یہانتک کہ ایک دن ماں، بیٹی کا ایک جوڑا اُس کے گھر آنے والا تھا، اور یہ معلوم تھا کہ دونوں ماں بیٹی، اُسے انتخاب کرنے کی نیت سے آرہی ہیں، اُس دن، میں نے ہی اُسے بتایا کہ کیا کپڑے پہنا چاہئیں اور کیا سنگار کرنا چاہیئے۔ ازدواج، حقیقتِ زندگی سے اس قدر متعلق ایک چیز تھی کہ اُس کا سوچنا بھی ممکن نہ تھا۔ میں تو اُس مناسبت، (یا اگر آپ اُسے اس لفظ سے یاد کرنا چاہیں تو) اس عشق کے جہتِ شعری کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی کو ایک خواب ابدی محبت میں رکھ کے اپنی زندگی بھی اسی مدہوشی میں گذارنا چاہتا تھا۔ بس اس قدر اور کچھ نہیں۔۔!

پھر گویا ان تمام حجتوں کی تائید کے لئے اس کے لبوں پر ایک ایسا تبسم،

اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسی نگاہ رچا ہوئی تھی جو مجھ سے بھی ایک صدقہ تصدیق مانگتی نظر آتی تھی کہ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کٹھ حجتوں سے خود اسکا دل بھی مطمئن نہیں ہوا۔ اگر میں ایک لفظ بھی ایسا کہہ دیتا جس سے شبہ ہوتا کہ میں ان حجتوں پر یقین نہیں کرتا، یا ذرا سا بھی خیال ایسا ظاہر کرتا کہ میں اُس کی غفلت حسیات سے جنہیں وہ کوشش کر کے بڑھانا چاہتا تھا، ہٹانا چاہتا ہوں، تو میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ ایک دم سارا اعتراف کر لیتا، رو پڑتا اور کہتا کہ میں اُس کے عشق میں مر رہا ہوں۔ لیکن اگر میں ایسا کرتا تو حقیقت میں گویا میں اُس کی موت لاتا۔ وہ اپنے دل کو دھوکا دینا چاہتا تھا، اور مجھے بھی لازم تھا کہ میں اس معاملہ میں اس کی تائید کروں، ورنہ اُس کے دلپر حقیقت ظاہر کرنے کی چوٹ لگتا یعنی یہ کہنا کہ دراصل تم اُسے از جان و دل چاہتے ہو، گناہ تھا۔ مجھے یہی لازم تھا کہ میں اُس کی اس کوشش میں کہ وہ اپنے زخم دل کو ڈھانپتا، اور اُس سے نگاہ ہٹانا چاہتا تھا، اس کی مدد کروں اور اس طرح اُس کی سلامتی کی خدمت کروں۔

لیکن کبھی کبھی وہ مجھ سے کھل جاتا، اور ایک دوسرے لہجہ میں کہتا:

"کہیں تمہیں خبر ہو کہ ان تمام حرکتوں سے جو لڑکپن سے زیادہ کچھ نہیں کبھی کبھی مجھ میں اک عجیب تاثیر حسرت پیدا ہوتی ہے۔ ہاں میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ کبھی کبھی ایک ایسی حسرت پیدا ہوتی ہے کہ میں رونے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ مگر ایسا کیوں ہے؟ جبکہ یہ لڑکپن، ہنسی کھیل سے آگے کے درجہ کی کوئی چیز نہیں، جب کہ اگر اس پر غور کیا جائے، تو اس کی قیمت ایک قہقہہ سے زیادہ نہیں، جب یہ حالت ہے تو یہ حسرت کیوں؟....

سوچا تو خود ہی اس کی حقیقت مجھ پر ظاہر ہوئی: ہمارا یہ کھیل ہمیشہ رہنا چاہیئے تھا، اُسے تا ابد ایک لڑکی رہنا چاہیئے تھا، اور مجھے تا ابد نوجوان لڑکا رہنا چاہیئے تھا۔ یہ حالت، بڑھنے والی کبھی نہ گھٹنے والے برسوں کی لامتناہی مدت کے ساتھ قایم رہنا، جاری رہنا چاہیئے تھی۔ یہ جواب بغیر اس کے کہ حقیقت کا ضربہ اسے لگے، یہ افق گریزاں بغیر اس کے کہ حد پر پہونچے، یوں ہی دراز ہوتے رہنا چاہیئے تھا۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔ ضرور ایک نہ ایک وقت آتا کہ ضربہ حقیقت اس شگوفۂ خیال پر پڑ کر اسے بکھیر دیتا۔ آخر وہ وقت آیا۔ اس کے مقابلہ کے لئے ہم کیا کر سکتے تھے؟ بیاہ؟ اس کا نتیجہ یعنی یہی نہ تھا؟ کیونکہ بیاہ کے بعد یہ خواب بالکل ملیامیٹ نہ ہو جاتا؟ مگر نہیں ملیامیٹ نہیں ہوا۔ ہمیں اُس زندگی کے شعر کو یاد رکھنا مقصود تھا، سو وہ شعر اب بھی شعر بلکہ تازہ ہے، اسکی یاد زندہ رہیگی اور زندہ ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کا خیال کرکے، مگر زیادہ لاہوتی، زیادہ روحانی مناسبت کے ساتھ (یہانتک کہ اب اس کے متعلق باتیں بھی نہیں ہوتیں) زندگی بسر کر رہے ہیں۔ گویا دور سے، یاد ایام کے ساتھ ایک خاموش عاشقی معشوقی لیکن...." لیکن کے بعد فقرے کو پورا نہیں کرتا، پھر اس تقریر کو جسے میں کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا ایک لمبے اور ٹھنڈے سانس سے جس میں بڑی کوشش سے وہ ایک قہقہہ بھی شامل کر سکا، ختم کر کے کہنے لگا: "کیا معلوم تم میری ان بے تکی باتوں پر دل میں کس قدر ہنستے ہوگے، اور میری حقارت کرتے ہوگے؛ اور اجی سچ پوچھو تو ساری اصل و حقیقت، سارا لطف شعر یہاں ہے"، یہ کہکے اپنے چہرے پر شوخی اور شرارت کا رنگ لا کے، مثلاً سامنے

چوپاٹی پر سمندر کے کنارے بنچ پر کوئی حسین پارسن بیٹھی ہوتی، اُسکی ریشمی ساڑھی کو سمندر کی ہوا ہٹا کے، اُس کی گوری گردن، اور ہلکے کپڑے میں چھپے ہوئے سینے کی جھلک دکھاتی کن انکھیوں سے اس کی طرف اشارہ کرتا۔

میں اپنے دل میں کہتا: "بدقسمت بیمار! غیر قابل شفا بیماری میں بیمار"، لیکن کچھ دنوں بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اُسے اپنی بیماری کا علاج مل گیا تھا۔ اب ایک نشوۂ بے قید کے ساتھ، اُن لوگوں کی طرح جو زندگی میں مزہ ہی مزا کرنا چاہتے ہیں، اُس نے اپنے تئیں اندھا دھند عیش میں ڈال دیا۔ ایک جاڑے کا موسم متواتر گرانٹ روڈ کے تھیٹروں ہی میں گذارا۔ مجھسے کہتا: "دن سو سو کے گذارنا بھی کیا مزے کی چیز ہے۔ انسان چونکہ سورج کو نہیں دیکھتا، اس لئے اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ رات کی زندگی گویا کرۂ ماہتاب میں جاکر زندگی بسر کرنیسی معلوم ہوتی ہے۔ جیا ہو تجربہ کرکے دیکھ لو۔" باقی وارد

(سجاد حیدر)

بیقراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر دل پر ہے اختیار کے ساتھ

اب کہاں وہ نمود گلشن کی
پھول رخصت ہوئے بہار کیساتھ

وہ یہاں آئیں یہ نصیب کہاں
ملگئی یاس انتظار کے ساتھ

ہائے بیچینیاں میرے دل کی
درد بھی تو نہیں قرار کیساتھ

دل سے ہے نوک جھونک مژگان کی
کیسا کانٹا پڑا ہے خار کے ساتھ

نرگس نیم مست نے مارا
بھر گیا جام اک خمار کے ساتھ

زندگی زندگی نہیں آزاد
لاکھوں دکھڑے ہیں جان زار کیساتھ

(بندہ حسن آزاد ہلوی)

ہماری قوّت بیانیہ کا زوال

اس میں تو شاید ہی کسی کو کلام ہو گا کہ ہماری قوّت بیان میں اب وہ رنگینی اور رنگ آمیزی نہیں رہی جو پہلے تھی یا جو فارسی زبان کی خصوصیت ہو گئی ہے۔ کسی فارسی کتاب کو اُٹھا کر دیکھ لیجئے زور بیان کا جلوہ اوّل سے آخر تک نظر آئیگا۔ جہاں جنگ کا تذکرہ آیا ہے وہاں صفوں کے صفحے مردانہ اشعار سے مزیّن ہیں۔ اگر حسن و عشق کا ذکر چھڑ گیا تو اسی پر زورِ انشا صرف کیا گیا ہے۔ اور صفت و ثنا تو گویا انپر ختم تھی۔ ایک باغیچہ کی تعریف میں وہ کتاب کی کتاب دلچسپی سے لبریز۔ اور نادر جذبات سے معمور رکھ سکتے تھے۔ آج وہ زور بیان کہیں نہیں نظر آتا۔ خیر فارسی تو رہی نہیں مگر فارسی کی جانشین اُردو میں بھی وہ بات نہیں ملتی۔ ابتدا میں بیشک اس نے بھی وہی رنگ اختیار کیا تھا۔ مگر چونکہ ابتدائی مشق تھی اس لئے بہت اچھی نہیں تھی۔ اگر مشق جاری رہتی تو شاید وہی خوبیاں پختہ ہو جاتیں۔ مگر مشق جاری کیونکر رہتی۔ زمانہ نے رنگ بدلا۔ اور زمانہ کے ساتھ ساتھ زبان نے بھی اپنا رنگ بدل ڈالا۔ اب ہم سلاست اور اختصار کے دلدادہ ہیں۔ ہماری کتابیں خواہ وہ مبتدیوں کے لئے لکھی جائیں۔ خواہ منتہیوں کے لئے سلیس ہونی چاہئیں۔ اور اس میں رنگ آمیزی کی ضرورت نہیں۔ اوّل تو رنگ آمیزی کے مسالے ہی نہیں باقی رہے۔ اور اگر مانگے تانگے کے خیالات سے تھوڑی بہت رنگینی پیدا بھی کیجا سکتی تھی

وہ اِن قیود کی وجہ سے رُک گئی - آج ناول اور تاریخ اور تذکرے اکثر شایع ہوتے رہتے ہیں مگر اُن کے واقعات کی تحقیق - اور سلاست زبان کی چاہے جتنی تعریف کیجئے انشا پردازی کے لحاظ سے وہ سب کی سب قریباً صفر کے برابر ہیں چنانچہ ہماری زبان کا روزمرہ تو صاف ہوتا جاتا ہے اور اُس کے علمی پہلو کی بھی تھوڑی بہت ترقی ہو ہی رہی ہے مگر ادبی پہلو روز بروز زوال پذیر ہے +

اس قوت بیان کے زوال کا سب سے بڑا اور مہلک سبب ہمارا افلاس ہے - پرانے زمانہ کے مصنفین شاہی درباروں اور امیرانہ شان وشکوہ کے جلوے دیکھتے تھے - بلکہ اکثر اوقات بادشاہوں اور امیروں کے دربار میں باریابی کا رتبہ رکھتے تھے شیشہ وآلات نادرہ ہیرے وجواہرات ظروف بیش بہا - جلوس شاہانہ - فوجوں کا طمطراق اور تزک واحتشام - اور خدا جانے کتنی ہی اور باتیں جوان کی نظروں کے سامنے روزمرہ گذرا کرتی تھیں اُن کا آج ہم خواب بھی نہیں دیکھ سکتے - آج کے مصنفین میں ایسے بہت کم ہونگے جنھوں نے ہیرے جواہرات کی صورت دیکھی ہو - خدا جانے مغرق عماریاں کیسی ہوتی تھیں - ظروف بیش بہا کا ہیکو کسی نے دیکھے ہونگے - اور فوجی شوکت اور دلیرانہ جانبازیاں تو گویا ہمارے لئے افسانے ہو گئے یہی سب قوت بیانیہ کو اُٹھانے والے اسباب تھے - جب مصنف کو نت نئے جلوے نظر آتے تھے تو زبان میں خود بخود روانی پیدا ہوتی تھی - اور خیالات نکل آتے تھے - اب تو یہ حال ہے کہ ہم تاریخوں یا قصہ کہانیوں میں بادشاہوں کا ذکر ہی نہیں کرتے - یا اگر ذکر کیا تو بس اتنا کہ وہ ایسا

مالدار تھا اور اتنی فوج رکھتا تھا۔ بس اس سے آگے قدم رکھنے کی ہم کو ہمت ہی نہیں ہوتی۔ شاید کسی اردو ناول میں آجتک کسی مصنف نے شاہی دربار کا نقشہ نہیں کھینچا۔ اور نہ کسی بادشاہ یا ملکہ کو ہیروئن بنایا۔ جب ہم یہ جانتے ہی نہیں کہ بادشاہوں کے لئے عیش و عشرت اور کرّ و فر کے کیا کیا لوازمات ہیں تب تک ہم اسے ہیرو کیونکر بنا سکتے ہیں۔ یا اگر کسی نے ایسا کیا تو اُس کے بادشاہ ہیرو اور سوداگر ہیرو میں کوئی نمایاں فرق نہ نظر آئیگا۔ اسی سے ہمارے ناولوں کی ہیروئنس اور ہیرو سیدھے سادے معمولی اوقات کے لوگ ہوتے ہیں۔ تاکہ اُنکی زندگی کا مرقعہ کھینچنے میں ہمیں ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں۔ اردو ہی میں پہلے فن موسیقی۔ فن شکار و بازیگری۔ فن شہسواری وغیرہ کی صدہا اصطلاحیں ہر خاص و عام کی زبانوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ اب ان فنون کے زوال کے ساتھ ساتھ وہ اصطلاحیں بھی فراموش ہوتی جاتی ہیں۔ کچھ دنوں میں ہم بجز کتابی زبان کے اور کسی زبان سے اُنہیں نہ سن سکیں گے۔ قومی افلاس کا اثر جسقدر زبان پر پڑتا ہے اتنا شاید اور کسی چیز پر نہیں پڑ سکتا +

(۲)۔ دوسرا سبب اس زوال کا۔ جسے ہم شاید افلاس ہی سے منسوب کر سکیں ہماری بدشوقی ہے۔ ہم میں اب بھی بفضل خدا ایسے بہت سے لوگ ہیں جو فراغت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جنہیں سیر و تفریح کے بہت سے موقعے حاصل ہیں۔ مگر ہم کچھ ایسے آرام طلب اور اپاہج ہو گئے ہیں۔ ہم میں زندہ دلی اس قدر مفقود ہو گئی ہے۔ اور ہمارے دلو نیچر کچھ ایسی اوس پڑ گئی ہے کہ کسی کام سے جسمیں غور و خوض اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے ہم جی چُراتے رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ ہیں

جنہوں نے تاج محل اور فتحپور سیکری کی عمارتیں دیکھی ہونگی - لیکن اگر اُن سے ان عمارتوں کے ایک ایک جزو کا نام پوچھا جائے تو وہ شاید مشکل سے بتلا سکیں - فن معماری کے متعلق بیشمار اصطلاحیں تھیں - اب ایک بھی نہیں سُننے میں آتی -- ہندوستان میں انواع و اقسام کے خوشرنگ طیور نظر آتے ہیں - افلاس نے ہماری آنکھیں تو نہیں بند کر دیں - مگر ہم میں سے کتنے ایسے لوگ ہیں جو ایک درجن سے زائد قسموں کے نام بتلا سکیں - شاید ہم میں ۹۹ بلکہ ۹۰ فیصدی لوگ ایسے ہونگے جو قمری کو نہیں پہچان سکتے بس طوطا - مینا - کوا - چیل یہی دس پانچ نام ہم کو یاد ہیں زیادہ نہیں باغیچے اب بھی اکثر بڑے شہروں میں موجود ہیں - انمیں رنگین مزاج لوگ تفنن طبع کیلئے جاتے ہو -- مگر ہم میں سے کتنے آدمی ایسے ہیں جو ایک درجن سے زائد پھولوں کا نام بتا سکیں - اُنکے خواص وغیرہ کا تو ذکر ہی فضول ہے - ہمارے ہی ملک کے پھولونکے پودوں پر آج باغیچوں میں انگریزی نام کے ٹکٹ چسپاں کئے جاتے ہیں - اور ہمیں اُن کے انگریزی نام تو معلوم ہیں - مگر اردو یا ہندی نہیں - جب ہماری طبعتیں ایسی مردہ و افسردہ ہو گئی ہیں تو بیان کو کیسے فروغ ہو - اور وہ رنگ آمیزی کرنے کے لئے کہاں سے مسالے لائے - جب آپ صحیفۂ فطرت کا مطالعہ ہی کرینگے - جب آپ قدرت کی خوبیاں ہی نہ دیکھیں گے - جب آپ آنکھیں بند کئے روٹی کے دھندوں میں لگے رہینگے تو آپ کہاں سے تشبیہات و استعارے لائیں گے - کیونکر قلم کی جودت دکھائیں گے - اور کیونکر انشاپردازی اور حسن بیان کے کمال تک پہونچ سکیں گے - اب تو ہم سے پرانے لقمے بھی نہیں چبائے جاتے - نہ ہم انہیں ہضم ہی کر سکتے ہیں - اور نہ اُن میں ہم کو مزہ ہی آتا ہے

افلاس اور مُردہ دلی دو بلائیں تو تھیں ہی۔ اُسپر مزید یہ کہ سستی شہرت پیدا کرنے کی ہوس ہر شخص کو دامنگیر ہے۔ جس نے دو چار کتابیں اُردو کی پڑھ لیں وہ لکھاڑا اور نثار بن بیٹھا۔ پہلا مضمون قلم سے نکلا۔ اور اس کے چھپوانے کی کوشش ہونے لگی۔ بھلا کچھ نہیں تو ہزار دو ہزار صفحے تو رنگ لئے جائیں قبل اس کے کہ کسی مضمون یا تصنیف کو شایع کرانے کا خیال پیدا ہو۔ چونکہ ہمارے مضامین کسی باقاعدہ مطالعہ یا ریاضت کا نتیجہ نہیں ہوتے اس لئے ہم کسی ایک شق ادب پر قایم بھی نہیں رہ سکتے۔ جو کچھ خیال میں آیا ٹیڑھا سیدھا لکھدیا۔ آج کوئی قصہ لکھدیا۔ کل کسی قرب وجوار کے شہر کا تذکرہ۔ پرسوں ایک تاریخی واقعہ کا ترجمہ۔ بعد ازاں کسی اور طرف جھک گئے۔ اس میں شک نہیں ہر رنگ میں چمکنے کی کوشش کرنا بہت قابل تعریف بات ہے اور ایک ہی رنگ میں محدود ہو جانے سے ہمارا قلم من مانے طرارے نہیں بھر سکتا۔ مگر ایسے دماغ جو ہر رنگ میں چمک سکیں۔ ایسی طبیعتیں جو نظم و نثر کے ہر رنگ پر قادر ہوں ایسا ذہن جو ہمہ گیر ہو شاذ کسی کو ملتا ہے۔ اگر ہم ایک صیغہ ادب کو لے لیں اور پڑھنے کے لئے جو چاہیں پڑھیں۔ مگر لکھیں اُسی ایک صیغہ کے متعلق تو ہماری زبان کو بہت فائدہ پہونچے۔ اگر ہمارا رجحان تاریخ نگاری کی جانب ہے تو ہم اسی شق ادب کو اپنا حصہ بنالیں۔ کوئی فلسفہ کی طرف مخاطب ہو۔ اور اسی شق ادب میں چمکنے کی کوشش کرے۔ کچھ لوگ زراعت و فلاحت پر مضامین لکھیں۔ غرض اپنے قلم کو کسی ایک میدان میں دوڑائیں تب ہم اُس ایک صنعت کے کُل الفاظ اور اصطلاحوں پر حاوی ہو جائیں گے۔ اور قوت بیانیہ کے نشو و نما میں اس سے بہت زیادہ مدد ملیگی۔ علاوہ ریں جوں جوں پرچے اور رسالے بڑھتے جارہے ہیں ہم میں زود نویسی کی عادت

پڑتی جاتی ہے۔ پرانے زمانے کے لوگ جو کچھ لکھتے تھے اُسے پہلے دس پانچ بار خود کاٹ چھانٹ کر اپنے دوستوں کو دکھاتے تھے۔ اب آجکل نیرنگیٔ کا دور ہے ایک بار لکھکر اُسے دُہرانا مذموم سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اصل مسودہ کو دوبارہ صاف کرنے کی محنت بھی نہیں برداشت کی جا سکتی۔ ایسی حالت میں زور بیان یا کمالات انشا پردازی کا دکھانا غیر ممکن ہی نہیں بعید از قیاس ہے۔ اور اس تیز نگاری کی شکایت کچھ اسی ملک میں نہیں ہے۔ انگلستان وغیرہ ممالک میں بھی لٹریچر کے ادبی پہلو کے زوال کی شکایت سُننے میں آتی ہے۔ جو رنگینی اور لطف زبان اور زور بیان الزبتھ کے عہد کے مصنفین میں موجود ہے وہ گذشتہ یا موجودہ صدی کے مصنفین میں نہیں ملتی۔ مگر ہاں اس کمی کے ساتھ ساتھ سائنس صنعت و حرفت اور فلسفہ میں انہوں نے اس مدت میں جو ترقیاں کی ہیں وہ اس کمی کی تلافی کر دیتی ہیں ہمارے ہاں ان اضاف کا تو کہیں ذکر نہیں۔ جو کچھ بساط ہے وہ ادبی مضامین اور کتابوں تک محدود۔ اور ان کا بھی یہ حال! نظم ہو یا نثر۔ زور بیان اُس کی جان ہے۔ جب یہی نہ ہوا تو وہ نظم یا نثر روکھی پھیکی ہوتی ہے۔ اس زوال کے لئے ہمارے طرز تمدن کا انقلاب بھی ایک حد تک جواب دہ ہے۔ اب نہ پرانے مراسم اداب رہے نہ وہ عیش و عشرت کے سامان۔ اور نہ اُمرا اور رؤسا میں وہ شوق۔ بجائے چوگان بازی کے اسکریکٹ اور پولو کا زور شور ہے بجائے رنگین جلسوں کے اب گارڈن پارٹیاں ہیں معاشرت میں جو ایک دلپذیر تکلف تھا اُس کی جگہ اب تکلیف دہ تصنع ہے۔ ان باتوں کی تفصیل کے لئے نہ ہماری زبان میں الفاظ ہیں اور نہ اصطلاحیں۔ اگر ہم کسی رئیس کے کمرہ کی آرائش کا بیان کرنا چاہیں تو

ہمارے امکان سے باہر ہے۔ اُس کا تین چوتھائی سامان بالکل انگریزی ہے جسکو لئے ہماری لغت میں الفاظ ہی نہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ زور بیان دکھانے میں کسیقدر تکلف پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر اسے قابل معافی سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ فن ادب کیلئے (تکلف دیگر تصنع نہیں) کی چاشنی ایک ضروری شے ہے + (نواب [illegible])

زنانہ حسن ولباس ۔ اس نام کی ایک کتاب مسٹر مدن گوپال صاحب ایم۔ اے۔ بلیڈر ساکن لاہور نے شایع کی ہے۔ اردو زبان کا علم ادب ابھی بہت محدود ہے۔ اور اس لحاظ سے جو کتاب کسی نئے مضمون پر تحریر کی جائے اس امر کی مستحق ہے کہ اسکی کافی قدر کیجائے تاکہ مصنف کی حوصلہ افزائی ہو۔ علم حسن پر انگریزی اور دیگر السنہ مغربی میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں۔ لیکن السنہ مشرقی اس شریف علم سے تقریباً بالکل معرا ہیں۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ مغربی اقوام مثل اہل یونان روما۔ اہل اطالیہ وغیرہ نے سنگ تراشی و مصوری کی جانب مشرقی اقوام سے زیادہ توجہ کی ہے خصوصاً انسان کی تصویر و بت بنانے میں تو وہ مشرقی اقوام سے گوئے سبقت لیگئی ہیں۔ اسکا لازمی نتیجہ ہے کہ جسم انسانی کی ساخت اور اسکے محاسن و معائب کے مشاہدہ کا شوق پیدا ہو۔ اور علم حسن کی ابتدا اس سے ہوئی ہے۔ بہر حال مسٹر مدن گوپال نے اردو علم ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے اور ہم ہر ایک تعلیم یافتہ شخص کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ مصنف کی بعض رائیں کسی قدر انوکھی ہیں۔ اور ہند کے اکثر لوگوں کو ناگوار گذریں گی۔ مگر اس سے کتاب کی دلچسپی میں فرق نہیں آتا۔ یہ کتاب بظاہر مستورات کے فایدہ کیلئے لکھی گئی ہے۔ مگر ہمیں افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مصنف نے مستورات کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر کے ان اصولوں کو مد نظر نہیں رکھا جن کی تلقین مشرقی تہذیب و مغربی تہذیب دونوں کرتی ہیں صاف الفاظ میں ہمارا یہ مطلب ہے کہ مصنف نے بعض مقامات پر بیجا صاف گوئی سے کام لیا ہے اور اس امر کو ملحوظ نہیں رکھا کہ صریح مستورات سے خطاب کرتے ہوئے بہت سی باتوں کا تذکرہ خلاف تہذیب خیال کیا جاتا ہے۔ یہ نقص اس قسم کا ہے جسکی وجہ سے ہمیں امید نہیں کہ یہ کتاب شمالی ہند کے معزز و پابند وضع گھرانوں میں کچھ زیادہ رواج پائے +

اس کتاب کی ظاہری خوبیاں بہت سی ہیں منجملہ انکے ایک یہ ہے کہ مختلف ممالک کے زنانہ حسن ولباس کی عکسی تصاویر چھاپ دیگئی ہیں۔ کتاب مجلد ہے قیمت قسم اول للعہ قسم دوم عہ مصنف سے مل سکتی ہے

مالوہ کی سیر

(۵)

برہان پور

بھوپال - اُجین - اندور - دہار - اور مانڈو کی سیر سے فارغ ہوکر ہم صوبہ خاندیس کی پرانی دارالسلطنت برہان پور میں پہونچے یہ اب ممالک متوسط کا ایک آباد قصبہ ریلوے اسٹیشن سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے اس شہر نے بہت سے تاریخی انقلاب دیکھے ہیں سنہ ۱۴۰۰ء۔۸۰۲ھ میں نصیر خاں فاروقی نے جو خاندان فاروقیہ خاندیس کا پہلا خود مختار بادشاہ تھا اس کی بنیاد ڈالی تھی - نصیر خان مذکور کا باپ ملک راجہ حضرت مخدوم زین الدین اولیاء دولت آبادی کا مرید اور خلیفہ تھا - جب نصیر خاں نے قلعہ آسیر کو فتح کیا تو شیخ زین الدین رح دولت آباد سے مبارکباد کے واسطے خاندیس تشریف لائے نصیر خاں مخدوم کے استقبال کے واسطے آگے بڑھا دریائے تاپتی کے کنارہ اس مقام پر جہاں اب زین آباد آباد ہے ملاقات ہوئی - نصیر خاں نے شیخ سے آسیر تشریف لے چلنے کے واسطے التماس کی - آپ نے فرمایا مجھے دریا سے عبور کرنے کا حکم نہیں ہے - نصیر خاں شیخ سے اجازت لیکر پلٹ آیا اور دریا کے دوسرے کنارہ پر جہاں اب برہان پور آباد ہے خیمہ اور خرگاہ لگاکر فروکش ہوا ہر روز پانچ مرتبہ شیخ کی ملازمت میں حاضر ہوکر فیض صحبت سے نیضیاب ہوتا تھا جب دو ہفتہ بعد شیخ نے دولت آباد کی واپسی کا قصد کیا نصیر خاں نے عرض کیا کہ اگر آپ فلاں قصبہ اور پرگنہ کو لیتہ فرمائیں تو نہایت سرفرازی ہوگی - شیخ نے باوجود بے حد اصرار کے

یہ امر قبول نہ فرمایا اور کہا کہ درویشوں کو قصبہ - پرگنہ - وظیفہ - سے کیا نسبت ہے - جب نصیر خاں نے بہت اصرار کیا تو شیخ نے فرمایا کہ دریا کے اُس پار کہ سلاطین اور غازیان اسلام کے نزول کا مقام ہے ایک شہر آباد کر کے میرے پیر شیخ برہان الدین غریبؒ کے نام پر موسوم کر اور اُسے اپنا دار السلطنت مقرر کر اور دریا کے اِس پار جہاں فقیر وارد ہے ایک قصبہ اور مسجد تعمیر کر کے اُس کا زین آباد نام رکھ اس تقریب سے اسلام اِن دونوں قطعات میں رواج پائے اور اِس درویش کا نام بھی باقی رہے - نصیر خان فاروقی شیخ کے اِس ارشاد سے بہت خوش ہوا اور اُسی وقت دونوں مقام کی آبادی کا حکم دیا شیخ نے فاتحہ مبارکباد پڑھکر دولت آباد کی طرف واپسی فرمائی - عرصہ قلیل میں شہر اور قصبہ نہایت معمُوری اور آبادی کے ساتھ اِختتام کو پہونچا اور برہان پور دو سو برس سے زائد یعنی ۱۰۰۸ھ تک سلاطین فاروقیہ کا دار السلطنت رہا - اس کے بعد اکبر کے قبضہ میں آیا اور سلاطین مغلیہ کے عہد میں شاہجہاں کے زمانہ تک کُل صوبہ خاندیس اور دکن کا صدر مقام اور بہت بڑا فوجی ہیڈ کوارٹر رہا - سلطنت مغلیہ کے زوال کے زمانہ میں نواب آصف جاہ اول (میر قمر الدین) کا قبضہ ہوا اور اُنہوں نے ۱۱۴۱ھ میں حصار شہر پناہ جواب تک موجود ہے تعمیر کرائی - ۱۱۷۴ھ میں مرہٹوں کے قبضہ میں آیا - اب ۱۸۰۳ء سے سرکار کے قبضہ میں ہے - اِس وقت یہ ضلع نمارڈ کے متعلق ایک تحصیل کا صدر مقام ہے آبادی قریب تیس ہزار کے ہے ۱۶۱۴ء میں سر طامس رو کی جو انگلستان سے دربار مغلیہ میں سفیر بنکر آئے تھے اسی شہر میں شاہزادہ پرویز جہانگیر سے ملاقات ہوئی تھی

ٹیورنیر فرانسیسی سیاح نے سنہ ۱۶۴۱ء میں اسے دیکھا تھا۔ یہاں کے آثار قدیمہ میں سب سے مشہور کارخانۂ آبرسانی ہے جس کے ذریعہ سے تمام شہر میں کثرت سے مصفا پانی پہونچایا جاتا تھا گردنواح میں میں آٹھ رجباہوں اور آبادی کے اندر بہت سے پختہ نلوں کے جنکی ساخت میں اعلےٰ صنعت پائی جاتی ہے نشان اب تک موجود ہیں +

آبادی سے ملے ہوئے قلعہ کے کھنڈر ہیں کہیں کہیں برج کا نشان اور چاردیواری باقی رہ گئی ہے قلعہ کے شمالی جانب دریا کے کنارہ پر محلات شاہی تھے جن کے کچھ کھنڈرات بھی موجود ہیں اور گذشتہ نقاشی اور رنگ آمیزی بھی کسیقدر باقی ہے دو تین پختہ حوض بھی نظر آتے ہیں۔ جنوب و مشرقی گوشہ میں ترکی وضع کا ایک زنانہ حمام سنگ مرمر کا کسیقدر اچھی حالت میں ہے جس میں اب ڈاک بنگلہ ہے اس کی چھتیں گنبدوار مثمن ہیں درمیانی حوض اب بند کردیے گئے ہیں مگر جھرنے اور نالیاں وغیرہ موجود ہیں اس حمام کی کرسی دریا سے ۸۰ فیٹ بلند ہے جہاں سے دریائے تاپتی کا جو نیچے بہتی ہے بڑا دلکش نظارہ ہے۔ قلعہ کے اندر جو مسجد تھی اس کے صرف مینار باقی رہ گئے ہیں۔

یہاں کی تمام مسجدیں علی العموم مینارہ دار ہیں اور سب میں حوض موجود ہیں اور چونکہ مسجد اور مندر پانی کے ٹیکس سے بری ہیں اس وجہ سے ویران سے ویران مسجد میں بھی نل لگے ہیں اور پانی موجود رہتا ہے بی بی کی مسجد۔ تانہ گوجری کی مسجد اور جامع مسجد کے مینار نہایت شاندار دور کوسوں سے نظر آتے ہیں۔ جامع مسجد کی عمارت نہایت خوبصورت اور شاندار ہے یہ سنگ سیاہ کی مسجد ہے جس کا رقبہ ۴۸ فیٹ ×

۵۱ ۳/۴ فیٹ ہے۔ اس میں پندرہ ۱۵ در اور چھیانوے ۹۶ ستون ہیں جو اس ترتیب سے نصب ہیں کہ مسجد پانچ درجوں میں منقسم ہوگئی ہے یہ ستون چوکور ہیں جن کا ہر ضلع ۱ فیٹ ۲ انچہ ہے۔ محرابوں پر اچھا کام ہے چھت لداؤ کی ۴-۴ ستونوں کے درمیان ایک خاص اور جدید صنعت سے بنائی گئی ہے جس سے مسجد کی خوبصورتی دوبالا ہوگئی ہے۔ بیرونی محرابوں پر کنگورہ اور چار منزلہ عالیشان میناروں پر سنہرے کلس جگمگاتے ہیں صحن میں پختہ دو فرش ہیں پہلا فرش ۷۵ ۱/۲ فیٹ اور دوسرا ۳۹ ۱/۴ فیٹ چوڑا ہے اس کے آگے دو حوض ہیں پھر دوسرا صحن اور اردگرد حجرے بنے ہیں صدر دروازہ مشرقی جانب اور ایک ایک چھوٹا دروازہ شمال و جنوب میں ہے۔ مسجد کے اندر درمیانی محراب پر محمد مصطفے خطاط کے ہاتھ کا لکھا ہوا عربی میں خوش خط خط نسخ میں کتبہ کندہ ہے جس سے واضح ہے کہ اس مسجد کو سلطان عادل شاہ ابن مبارک شاہ فاروقی نے سنہ ۹۹۷ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ اسی مضمون کا ایک کتبہ عربی اور ہندی زبان میں شمالی محراب پر بھی کندہ ہے۔ جنوبی مینار کے نیچے میر معصوم نامی کے ہاتھ کا کندہ کیا ہوا کتبہ ہے جس کے حروف مٹ گئے ہیں اور صاف پڑھنے میں نہیں آتے اس میں شہنشاہ اکبر کے خاندیس میں تشریف لانے اور قلعہ آسیر کو فتح کرنے اور رمضان سنہ ۱۰۰۹ھ میں واپس جانے کا ذکر ہے +

برہان پور میں بزرگان دین اور اولیاء اللہ کے بہت سے مزارات اور درگاہیں ہیں جن پر عرس اور میلے ہوتے ہیں میں شاہ منصور رح شاہ بہاء الدین رح۔ شیخ عیسیٰ رح۔ شاہ برہان الدین رازی اللہ۔ شاہ جمال

قادری رح۔ شاہ ہیم رح۔ شیخ نظام الدین چشتی بھکاری رح کی درگاہوں پر حاضر ہوا۔ سب درگاہوں میں گنبد اور اکثروں میں بڑی بڑی مسجدیں اور خانقاہیں بنی ہوئی ہیں سب سے بڑا عرس شیخ نظام الدین چشتی رح کا ہوتا ہے جس میں باہر سے بھی آٹھ دس ہزار آدمی آتے ہیں آپ کی درگاہ شہر کے باہر اتوارہ دروازہ سے میل بھر کے فاصلہ پر ایک پہاڑی نالہ تولی کے کنارہ پر واقع ہے یہ نہایت بلند اور پُر فضا مقام ہے۔ حضرت شیخ کا وصال ۹۸۵ھ میں ہوا تھا اہل برہان پور کو سب سے زیادہ اس درگاہ سے عقیدت ہے +

اتوارہ کے دروازہ کے باہر سب سے زیادہ آثار قدیمہ ہیں بہت سے گنبد اور مقبرے نظر آتے ہیں ایک وسیع چہار دیواری کے اندر تین گنبد ہیں ان میں شاہان فاروقیہ کے مزار ہیں سب سے عالیشان گنبد میں عادل شاہ فاروقی کا مزار بنایا گیا ہے لیکن کسی پر کتبہ نہیں ہے اور ایک ایک گنبد میں کئی کئی قبریں ہیں۔ ایک چہار دیواری کے اندر سب سے زیادہ خوبصورت گنبد ہے جو شاہ سوزا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے گنبد کے نیچے کا حصہ ۱۲ پہل کا ہے۔ ہر پہل میں نہایت خوشنما در بنے ہیں اور بہت نفیس نقاشی اور گلکاری کی ہوئی ہے جو اب تک اچھی حالت میں اور قابل دید ہے۔ اوپر سے گنبد خربوزہ کی شکل کا ہے جس کے آس پاس چھوٹے چھوٹے گنبد اور مینار بنے ہیں جس چبوترہ پر یہ گنبد بنا ہوا ہے وہ بھی خوبصورت اور ۱۲ پہل کا ہے +

برہان پور سے ایک کوس کے فاصلے پر ایک خوبصورت عالیشان مقبرہ شاہنواز خان کے نام سے موسوم ہے یہ غالباً مرزا عبدالرحیم خان

خانخانان کے بڑے بیٹے مرزا ایرج کا مقبرہ ہے جو جہانگیر کے عہد میں منصب پنجہزاری پر سرفراز اور شاہنواز خان کے خطاب سے موصوف تھا یہ نہایت شجاع اور عالی ہمت امیر تھا برہان پور میں اب تک اُس کی شجاعت و بہادری کی کہانیاں مشہور ہیں اس جگہ سالانہ میلہ لگتا ہے جو ایک ہفتہ تک رہتا ہے گنبد کے نیچے کا حصہ فراخ ہے جس کا ہر ضلع ۲۶ فیٹ ۷- انچہ ہے اصلی قبریں تو تہ خانہ کے اندر ہیں لیکن درمیان میں بلند چبوترہ پر سنگ مرمر کے دو تعویذ بنے ہیں۔ در و دیوار پر نہایت عمدہ اور قابل دید گلکاری کی ہوئی ہے۔ گنبد کے اطراف میں ۳-۳ در کا برامدہ اور چاروں گوشوں میں ایک ایک کوٹھری ہے۔ مقبرہ کی شمالی حد پر گوشوں میں ایک ایک گنبد ہے جس پر کسیقدر چینی کا کام باقی ہے جنوبی سمت میں صدر دروازہ ہے +

اکبری و جہانگیری عہد میں خانخانان عبد الرحیم خان عرصہ تک برہان پور میں مقیم رہے اُن کی یادگار سے ایک پختہ سرائے باقی ہے جس میں اب بازار لگتا ہے دروازہ کی پیشانی پر یہ کتبہ کندہ ہے " در عہد سلطنت ظل اللہ فی الارضین نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ و عدلہٗ..... خانخانان سپہ سالار خلد شوکتہ حسب الامر جہان مطاع باہتمام خلیل اللہ پسر بہادر خان در سنہ ہزار و بیست و ہفت این سرائے باتمام رسید " تاپتی کے دوسرے کنارہ پر قصبہ زین آباد آباد ہے جس کی مسجدیں قلعہ سے دکھائی دیتی ہیں۔ شاہجہان ایام شاہزادگی میں بہت عرصہ تک برہان پور میں رہا اُس نے زین آباد میں ایک وسیع باغ تعمیر کرایا تھا اس میں حوض کے اندر ایک خوبصورت عمارت تھی ۱۷ ذیقعد سنہ ۱۰۴۰ھ کو ممتاز محل کا انتقال برہان پور میں ہوا تھا مرحوم کی لاش بطور امانت اسی عمارت میں

اوّل دفن کی گئی تھی یہاں سے، ۱۷ جمادی الاوّل سنہ ۱۰۴۱ھ کو منتقل کرکے آگرہ بھیجی گئی اس باغ کے نشانات اب بھی موجود ہیں +

سعید احمد مارہروی

غزل

از تصنیف جناب لالہ بہاری لال صاحب مشتاق دہلوی

عالمِ بالا کی سیریں شیشہ و ساغر میں ہیں
مستِ مَے گویا کہ بزمِ ساقیِ کوثر میں ہیں

یہ قیامت کی ادائیں آپ کی ٹھوکر میں ہیں
رہگزر کے رہنے والے عرصۂ محشر میں ہیں

گو بظاہر چین سے بیٹھے ہوئے ہم گھر میں ہیں
گردشِ طالع سے گویا گھر میں بھی چکر میں ہیں

طفلِ گہوارہ نشیں کی طرح وہ بھی خیر سے
شوخیوں سے دست کش ہیں اور دلِ مضطر میں ہیں

وصل کی شب وہ چڑھانا تیوری کا ہجر میں
یوں لُٹاتا ہے کہ لاکھوں سلوٹیں بستر میں ہیں

پاسباں گویا ہمارے شوق سے آگاہ ہے
یہ نہیں کہتا کبھی ظالم کہ اب دم گھر میں ہیں

رشتۂ اُلفت کا پھندا پڑ گیا سلجھائے کون
جس سے ہم اُلجھے ہوئے اپنے ہی بال و پر میں ہیں

ہے قفس میں ہمکو آزادی کا رونا ہمصفیر
غم نہیں ہے آب و دانہ کا کہ دونوں گھر میں ہیں

خونِ عاشق ہے معاونِ سُرخیِ رخسار کا
توڑ کر آئینہ وہ مُنہ دیکھتے خنجر میں ہیں

چشمِ بینا ہو تو حاجت طورِ سینا کی نہیں
اُسکے جلوے ہر در و دیوار و ہر منظر میں ہیں

قدرتِ حق جس نے دیکھی ہو نہ محدود آج تک
دیکھ لے اُنکو کہ وہ بیٹھے ہوئے منظور میں ہیں

آستاں پر اُنکے کی پیکر تراشی وہم نے
محوِ حیرت ہوں کہ کیا کیا صورتیں پتھر میں ہیں

خرقِ عادت شعبدے اعجاز جادو اور طلسم
دیکھنے سارے تماشے کوچۂ دلبر میں ہیں

تم تو اے مشتاق ہو سر رنگ میں رنگے ہوئے
صوفی و صافی بڑے بھائی تمھارے گھر میں ہیں

احباب

آفرینش عالم کے بعد جب سے کہ بنی آدم کی تعداد بڑھنے لگی۔ قدرتاً یہی دستور چلا آتا ہے۔ کہ ہر ایک شخص کے ہزاروں آشنا اور واقف ہونگے۔ ہمیں مختلف جماعتوں۔ مختلف فرقوں۔ مختلف مذاہب کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن ان میں سے چند اشخاص ایسے ہوتے ہیں۔ جنکے ساتھ ہمارا تعلق باقیوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ وہ شخص ہیں جنکی صحبت سے ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جن سے ہم اپنے راز نہیں چھپاتے۔ جن سے ہمیں بوقت ضرورت امید امداد ہوتی ہے۔ جو ہماری خوشی و غم میں شریک ہوتے ہیں۔ اور یہی شخص ہیں جنہیں ہم دوست کہتے ہیں +

ہمارے باہمی تعلقات میں سے دوستی ایک بڑا بھاری رشتہ ہے کسی نے اسے ایک سنہری تار قرار دیا ہے۔ جو دلوں کو آپس میں پیوستہ کرتا ہے۔ ایڈیسن نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے۔ "کہ دوستی دو شخصوں کے درمیان ایک دوسرے کو فائدہ پہونچانے اور ایک دوسرے کی خوشی بڑھانے کی طرف دائمی میلان کا نام ہے" یہ ایک ایسا رشتہ ہے کہ ہماری زندگی پر ایام طفولیت سے لیکر اخیر عمر تک اس کا اثر ہوتا رہتا ہے۔ اسی سے ہماری ہوسیں بڑھتی یا فرو ہوتی ہیں۔ اسی کے سبب ہماری تکالیف بڑھتی گھٹتی ہیں۔ یہی ہمارے شکوک پیدا و رفع کراتی ہے۔ ہمارے دلوں کا بخل و کرم اسی پر منحصر ہے۔ اظہار و اخفائے خیالات اسی کے ماتحت ہے۔ غرضیکہ زندگی کے منازل کے راحت و رنج کا اکثر حصہ اسی پر منحصر ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ اس رشتے کو مناسب و مضبوط رکھنا ایک نہایت ہی ضروری فرض انسانی ہے +

دوستی کا ایک اعلےٰ نمونہ دنیا کے حقیقی مذاہب کے بانیوں میں پایا جاتا ہے۔ اس پسندیدہ علاقہ میں ان کا طرز سلوک ایک آئینہ ہے۔ جسمیں تمام حقیقی محبت کا عکس دیکھنا چاہیئے۔ اس کی قدر ان لوگوں کو معلوم ہے۔ جنہیں ان برگزیدگان خدا کی زندگی کے حالات سے کماحقہ واقفیت ہے وہ ہر ایک شخص کے جو اُن کے احکام کی تعمیل اور اُن کے طریق کی پیروی کرے دوست و معاون ہیں +

اس امر کی اہمیت کے ثبوت میں کہ اس رشتہ کے جوڑنے توڑنے میں نوجوانوں کو خاص توجہ چاہیئے۔ دو امر قابل غور ہیں :-

(۱) اپنے بیگانے [illegible] کے لئے ہمارا انتخاب احباب ہماری خصائل کا ایک صحیح معیار ہے۔ واقعی انسان کی قدر اس بات کے دیکھنے سے بخوبی معلوم ہو سکتی ہے کہ اس کے اصحاب و ہمنشین کیسے ہیں۔ اگر ہمارے اصحاب اخلاق میں گرے ہوئے ہیں تو مشہور ضرب المثل "کند ہمجنس باہمجنس پرواز" لوگوں کو ضرور اس فیصلہ پر آمادہ کریگی۔ کہ ہم میں بھی کوئی اخلاق نہیں ہیں۔ اس فیصلہ کی صحت و راستی یقینی نہیں تو اغلب ضرور ہے۔ برعکس اس کے اگر ہماری صحبت خوش خلق معزز۔ ایماندار اور با اصول لوگوں سے ہے۔ تو خلق خدا ضرور ہمیں عزت کی نگاہ سے دیکھیگی۔ اور ہم پر اعتبار کریگی۔ اس لئے ہم اگر چاہتے ہیں کہ ہماری نسبت عوام کی رائے نیک ہو تو دوست بنانے میں پورے درجے کی احتیاط کو فرض سمجھیں اور اُس کی ادائگی میں تل بھر بھی کوتاہی نہ کریں +

(۲) ہمارے خصائل کے بنانے بگاڑنے میں جتنا اثر صحبت کا ہوتا ہے اور کسی تعلق کا نہیں ہوتا۔ کمینہ اشخاص کی صحبت میں بیٹھنا زندگی برباد کرنا ہے اور یہ کوشش کرنا کہ کسی سوسائٹی میں بیٹھکر بغیر اس سے متاثر ہونیکے اس سے نکل آئیں۔ رائگاں ہے صحبت کا اثر آہستہ آہستہ ہوتا ہے لیکن یہ اثر زہر قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ خواہ کسی کو محسوس نہ ہو۔ لیکن انسان کے نیک خیال وافعال کا خون کر دیتا ہے۔ ؎

اسپ و خر را گر بہ بندی مدتے یکجا بہم   رنگ او پر جا بماند خوئے او چون خر شود

ہندوستان کے اکثر نوجوان، دوست بنانے میں پرلے درجے کی بے پروائی برتتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ ملک و قوم کی ترقی خود اُن کی ذاتی ترقی پر منحصر ہے اور اُن کی ترقی اُن کے اخلاق پر اور پھر اخلاق منحصر ہے صحبت کے۔ انکی یہ بے پروائی بربادی کی علامت ہے۔ وہ اپنی کشتی اپنی آنکھوں سے ڈوبتی دیکھکر بھی اتنی ہمت کے مالک نہیں ہیں کہ کمر کس کر اسے بچائیں واللہ اعلم وہ اپنی غفلت۔ خود غرضی نااتفاقی۔ بیدردی کو کب چھوڑینگے ہاں اتنا ہے کہ غیر اقوام کی دیکھا دیکھی فوری جوش تو دکھانے لگے ہیں۔ مگر یہ نہیں دیکھتے کہ ترقی قوم کے اسرار کیا ہیں۔ وہ دیگر قوموں کے افراد کی ان باتوں میں تو تقلید کرتے ہیں۔ جو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچاتی ہیں۔ لیکن جان بوجھکر اُن امور سے غافل ہیں۔ جن پر فی الاصل اُن کے بچاؤ کا دارومدار ہے۔ ہزارہا تجربات کے بعد بھی اُن کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔

دوست بنانے کے لئے اصول و قواعد تیار کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ لیکن دو چار باتیں جنکی بنا تجربہ پر ہے رہبری کے لئے بشرط عمل مفید ثابت ہونگی ✣

ہمیں اوّل تو دوستی قایم کرنے میں اور پھر جب قایم کریں تو اس کے توڑنے میں ہرگز جلدی نہیں کرنی چاہیئے۔ اکثر اشخاص کا قاعدہ ہے جونہی کسی سے آشنائی ہوئی۔ جھٹ اس کے آگے اپنے راز ظاہر کر دیئے۔ اور ایسی بے تکلفی پیدا کرلی۔ کہ گویا وہ کبھی غیر ہی نہ تھے۔ اور چشم زدن میں یار غار بن بیٹھے لیکن ایسے اشخاص کو اپنی اس جلدی کا ثمرہ بھی جلدی ملتا ہے۔ اور پھر نقصان اُٹھا کر پچھتاتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ جلدی کی پیدا کی ہوئی دوستی ٹوٹتی بھی جلدی ہے۔ ۶۔ بزودرشتہ کشیدہ بزودے گسلد مناسب ہے کہ ہمارے پاس اس شخص کے پرکھنے کے لیے جس کو ہم اپنا دوست بنانا چاہتے ہیں۔ چند اصول کسوٹی کی طرح تیار رہیں اور پھر جب دوستی ہوگئی۔ تو اُس کے قایم رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا چاہیئے۔ خدانخواستہ اگر دوست سے نزاع ہوکر تعلق شکستہ ہوجاوے۔ تو ایک تو دوست ہاتھ سے گیا دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دشمن اور بڑھ گیا۔ اور پھر کئی طرح سے تمہارا فایدہ نقصان اس کے ہاتھ میں ہے۔ تمہارے راز اس کے دل میں ہیں۔ ممکن ہے اس کا دل اس کی زبان کے سپرد کردے۔ اور یہ یاد رہے۔ کہ یہ تاگا ٹوٹا پھر جوڑنا قریباً ناممکن ہے اور بالفرض اگر پھر گانٹھ بھی لیں تو یہ جوڑ ہمیشہ کے لئے ایک ناموافق زمانہ کی یادگار رہ کر کانٹے کی طرح چبھتا رہے گا۔ اور وہ باہمی صفائی جو اس شکست سے پہلے تھی پھر ہونی ناممکن ہے +

امریکہ کے ایک مشہور مصنف نے خیالات انسانی کو ایک مکان سے تشبیہہ دی ہے۔ جس کے انگریزی طرز عمارت کے موافق دو دروازے ہیں انمیں سے ایک دروازہ تو شارع عام کی طرف ہے۔ اور اس سے عام آشنا

ملاقات کے کمرہ میں جا سکتے ہیں۔ اور اس کمرہ سے پھر رستہ پرائیویٹ کمرہ کو جاتا ہے اور شارع عام سے ایک پوشیدہ کوچہ مکان کے دوسرے دروازے کی طرف جاتا ہے جس سے براہ راست آدمی پرائیویٹ کمرے میں داخل ہو سکتا ہے اس خیالی مکان کا پہلا دروازہ بعض آدمی بالکل کھلا رکھتے ہیں۔ بعض ایسے قفل لگا دیتے ہیں۔ بعض صرف زنجیر لگا کتفا کرتے ہیں جس سے باہر کا آدمی جھانک کر اندر نگاہ ڈال سکتا ہے۔ لیکن اندر نہیں جا سکتا اور بعض اُس دروازے کو بالکل مسدود ہی کر دیتے ہیں تاکہ دہلیز کے اندر نگاہ کا قدم بھی نہ پڑ سکے +

اس دوسرے دروازے کی ایک چابی تو ضرور ہوتی ہے جو سالہا سال تک ماں کے پاس مخفی رہتی ہے۔ بعض دفعہ نئی چابیاں بھی ہوتی ہیں جو باپ۔ بھائی۔ بہن اور کسی دوست کو خاص موقعوں پر دیجاتی ہیں۔ ہر لحظہ کے رفیق و ہمراز یعنی خاوند یا بیوی کا بھی حق ہے کہ اُسے اس دروازے کی ایک چابی ملے۔ اگر نہ ملے تو زندگی طرفین کی یقینی طور پر تلخ ہو گئی۔ اگر تقدیر نے یہ چابی تمہاری کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں دیدی جس کے سینے میں کینہ اور دل میں ظلم بھرا ہوا ہے۔ تو تم واقعی قابل رحم ہو۔ اور تمہارا مرض قریباً لاعلاج ہے۔ اس کا اختتام و انجام یا تو سر شکنی اور خودکشی پر ہوتا ہے۔ یا اس کے ایام غمگینی اور کس مپرسی کی حالت میں گذرتے ہیں۔ لہذا اس چابی کو کسی کے حوالے کرتے وقت کمال درجے کی احتیاط چاہیئے۔ اغلباً انسان کی زندگی کے اکثر حصے کا رفیق وہ شخص ہے۔ جس سے رابطۂ نکاح ہو۔ اس لیے اس رفیق کے انتخاب پر انسان کی جملہ راحت و رنج کا فیصلہ ہے۔ خدا کے فضل سے

اگر ہمراز ہمخیال اور موافق رفیق سے سابقہ پڑا تو ہزار ہزار شکر اگر حالت دگرگوں ہے تو اے بیچارے قسمت کے مارے۔ جا اور قسمت کو روتا رہ خوشی سے ہاتھ دھو اور اپنی تقدیری مایوسی میں معمولی فرائض ادا کرتا ہوا وہ ایام جو تیرے لئے اس ناپائیدار دنیا میں رہنے کے لکھے ہیں۔ گذار دے +

اُس شخص کی دوستی ہرگز قبول نہ کرو۔ جس کا میزان حق تمہارے درجہ تمیز حق سے ادنیٰ ہے جس آدمی میں اخلاق کی قدر نہیں اُس کی صحبت سے بچتے رہو۔ جو انسان بے اصول زندگی بسر کرتا ہے اُس کی رفاقت ترک کر دو۔ اور یہ معلوم کرنا کہ کسی شخص میں تمیز حق اور قدر اخلاق ہے یا نہیں۔ اور آیا اُس کی زندگی کے اصول بھی ہیں یا نہیں۔ کوئی دشوار کام نہیں ہے اُس کی گفتار سے تمہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ اسے دیانتداری۔ راستی بھلائی کا کہاں تک پاس ہے اس کی رفتار سے تمہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس طبیعت کا بندہ ہے۔ کسی خائن آدمی کی بیجا تعریف کرنا اور جاندار کیڑے پر بے ضرورت و عمداً پاؤں دھرنا اُس کی طبیعت کی خیانت و ظلم کو جھٹ ظاہر کر دیتا ہے۔ ایسے آدمی سے بھلائی کرو۔ خوش خلقی سے پیش آؤ۔ نصیحت کرو لیکن دوستی کے قابل نہیں +

دوستی بنانے میں ہمسری رتبہ کا خیال ضرور چاہیئے۔ اپنے سے زیادہ دولتمند سے دوستی رکھنا اپنے میں ضرورت و آمد کی نسبت زیادہ خرچ کرنے اور کر کے بچتانے کی عادت ڈالتا ہے۔ لوگ خوشامدی طامع سمجھتے ہیں اور خود اپنی فروتنی محسوس کر کے ہر دم ملول رہتا ہے۔ اپنے سے زیادہ بد کی رفاقت زیور دل پر زنگار چڑھاتی ہے یوں تو از روئے انسانیت ہر فرد بشر تمہارا بھائی اور دوست ہے لیکن ہر ایک سے ایک ہی سلوک

برتنا خدا تعالےٰ کی منشاء کے خلاف ہے۔ ہاں البتہ اپنے سے زیادہ نیک کی صحبت سونے پر سہاگے کا اور زنگ آلود دل پر صیقل کا کام دیتی ہے۔ اپنے سے کم رتبہ انسان سے دوستی اکثر باعث تکبّر ہے۔ ہم اُن سے خدمات لیکر اپنے سر و لب ہلا دینے کو کافی معاوضہ سمجھتے ہیں

جہاں تمھاری کسی بلند خیال و عالی ہمت شخص سے دوستی ہے وہاں ایک سادہ وضع و سادہ خیال انسان سے بھی اتحاد ضروری ہے۔ حاصل کردہ فیض اِس ذریعہ سے بآسانی اوروں کو پہنچا سکتے ہو۔

ایسے شخص ایک لوح صفا کی مانند ہوتے ہیں۔ جو پسند آئے لکھو۔ اس لیے اگر تمھیں اپنے ایمان اور افعال پر پورا بھروسہ ہے تو ضرور ایسے انسان مہیا کرو۔ اور ان اشخاص کو اپنے ہاتھوں اپنی مرضی کے موافق اپنے ہمخیال دوست بنا سکتے ہو۔ مگر اسمیں مشق و صبر لازمی ہیں۔

اُس شخص کی دوستی سے دور رہو جسے اُن اشیاء یا اشخاص کی قدر نہیں جو تمھارے نزدیک پاک۔ متبرک اور قابل ادب ہیں منکران خدا قابل رحم ہیں لیکن اُنکی دوستی قابل ہے غیر مذہب کے افراد سے دوستی رکھنا نیکی ہے لیکن اگر وہ اِسقدر تاریک ضمیر رکھتے ہیں کہ تمھارے خدا۔ تمھارے پیغمبر۔ تمھاری کتب مذہبی۔ تمھارے اوتار تمھارے بزرگان دین تمھارے ملک و قوم کے بہادروں اور جان نثاروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو بے شک انہیں چھوڑ دو۔

دوستی کے لیے عاقل و دانا بشر مہیا کرنا لازمی نہیں ہے۔ سادہ و پاکیزہ خیال انسان اچھا ہے۔ ایک معمولی دھات کی لیکن مضبوط پرزوں کی اور ٹھیک وقت دینے والی گھڑی رکھنا ازبس مفید ہے سنہری کیس والی کی نزاکت تمہیں بجز تکلیف حفاظت و نگہبانی کے کوئی فائدہ نہیں دیسکتی۔ عقلمند دوست کا کام تو کتابوں سے بھی لے سکتے ہو۔

دنیا میں تین قسم کے دوست ملتے ہیں۔ جانی۔ زبانی۔ اور نانی۔ جانی دوست تو وہ شخص ہیں جو دل سے ہمارے خیر خواہ۔ ہر دم ہمارے ہمدرد۔ ہمیشہ ہماری امداد کو کمربستہ۔ ہمارے سامنے ظاہر و باطن سے صفا۔ ہمارے دوستوں کے دوست ہمارے دشمنوں سے بیزار۔ غرضیکہ

ہمارے لیے بوقت ضرورت جان دینے کو تیار رہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھیں ہم دوست کہہ سکتے ہیں۔ اور جن کی محبت و قدر ہمارا عین فرض ہے ؛

زبانی۔ وہ لوگ ہیں جو مُنہ سے ہر دم دوستی کا دم بھریں۔ جو اپنی نمکین لاف وگزاف اور سخنہائے شیریں و پُر الطاف کو ہمارے کانوں تک ہی محدود رکھیں۔ نہ کبھی ایفائے وعدہ کا ارادہ اور نہ کبھی امداد کو آمادہ۔ اِن بیچاروں کی برائے نام دوستی کا بس یہی عوض ہے کہ وہ اپنی میٹھی میٹھی باتیں سنائے جائیں اور سامعین موقع کے مناسب رو کر یا ہنس کر ہاں میں ہاں ملائے جائیں۔ اور بمقابل ہمدردی اِسلیئے ہیں کہ جسدن انہیں کوئی اِس قسم کا سامع نہ ملے تو اپنی زندگی کو تلخ سمجھتے ہیں ؛

دوستانِ نانی! نعوذ باللہ! مجھے تو اِس جماعت کا نام لیتے بھی ڈر لگتا ہے۔ یہ وہ خود پرست طبیعت کے بندے ہیں جو اپنے دامِ تزویر میں پھنسائے ہوئے قسمت زدگان کو کھا جانے والے ہیں۔ اِنکی خودغرضی کا دہن بے انتہا کشادہ ہے۔ اِنکے ظلم کا شکم ایک غار ہے۔ اِنکی رہبری کنوئیں میں گرانے والی اِنکی نصیحت گمراہ کرنے والی۔ اِن کا وعظ دوزخ میں لے جانے والا۔ یہ زاہد صورت خودغرضی کی پوجا کرتے ہیں۔ اِن کا ہر ایک کام اِسی کی عبادت و اطاعت میں ہوتا ہے اور اُنکی ہر ایک بات اسکی دعا میں ہوتی ہے۔ اپنی ضرورت کے وقت تمہارے حقیقی برادر۔ صادق دوست۔ خالص مددگار۔ جب تمہاری باری آئے تو نہ تو وہ تمہارے دوست ہیں نہ آشنا۔ نہ بھائی ہیں نہ یار۔ پس اے ظاہر بینو! اِن ظالم صیّادوں اور کمینگی کے خانہ زادوں سے بچے رہو۔ اُنکی شیریں سخنی کے دانہ تلے سیہ دلی کا جال بچھا ہوا ہے"؛

استحکام دوستی کے لیئے چند باتیں مفید ثابت ہونگی

(۱) اپنے گھر کے راز دوستوں سے بھی بیان نہ کرو ؛

(۲) دوستوں سے نہ قرض لو نہ اُنھیں قرض دو۔ حتی الامکان ایسے تعلقات سے بچو ؛

(۳) ہمیشہ اُن کے آگے ظاہر باطن صفا رہو۔ میلا دل اور میلا بدن نفرت اور حقارت پیدا کرتے ہیں +

(۴) اُنھیں کبھی آزردہ نہ کرو۔ ہمیشہ نرمی سے گفتگو کرو۔ کسی قسم کی بحث و مخالفت درمیان نہ لاؤ۔ غصہ کے وقت تحمل سے کام لو +

(۵) دوستوں کی شکایت غیر کے منہ سے سُننا یا غیر کے آگے کرنا کبھی پسند نہ کرو +

(۶) دوستوں میں سے کسی کے روبرو ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دو +

(۷) اگر باہم کچھ رنجش ہو گئی تو جا کے معافی مانگو +

(۸) جملہ شکوک فوراً رفع کراؤ +

(۹) اگر قول یا فعل میں وہ تمہارے موافق نہیں تو بُرا نہ مانو +

(۱۰) اگر تمہیں کوئی تکلیف ہو تو بے شک دوستوں سے طالب امداد ہو۔ لیکن معمولی یا بالکل وہمی تکالیف کے لیے انھیں تکلیف نہ دو +

(۱۱) اپنے احباب کے لیے صدق دل کے ساتھ خدا سے دعا طلبی کیا کرو +

آزمائش کا ایک مجرب طریقہ۔

چند دوست ہمیشہ مجھے اپنے مکتوبات میں لکھتے رہتے کہ "کار ہا رلایقہ سے خورسند فرمادیں۔ مشکور ہوں گا"۔ میں بھی تنگ آ گیا۔ آخر ایک ایک کو مختلف "کار ہا رلایقہ" لکھنے شروع کر دیئے۔ خواہ ضرورت ہوتی یا نہ ہوتی۔ کسی کو لکھدیتا۔ اِتنے روپے بھیجدو۔ مجھے ضرورت ہے۔ کسی سے کوئی اور چیز منگواتا۔ علی ہذا القیاس مختلف فرمان بھیجدیئے۔ اس سے مجھے اِتنا فائدہ ہوا کہ اِن احباب میں سے اکثر کے اب خط تھوڑے آتے ہیں۔ جس پر مجھے بھی جواب تھوڑے دینے پڑتے ہیں۔ بعض نے خط و کتابت ہی ترک کر دی۔ اور بعض نے وہ رویہ پُر ریا کلمات لکھنے کا چھوڑ دیا۔ ریا اور ظاہرداری بہت بُری چیز ہے۔ خدا ہمیں راہ راست پر چلائے +

ا۔ ب۔ طیب۔ نیوٹن ہال لاہور

"خاندانِ شریف"

دلّی کانِ جواہر دلّی۔ جو کبھی لعل اُگلتی تھی۔ جس کی خاک پاک سے صاحبدل اربابِ کمال اُٹھتے اور اپنی رنگا رنگ لیاقتوں سے اِس فضا میں قوس و قزح کی سی بہار دکھاتے تھے۔ جہاں علم و فضل کے چشمے اُبلتے اور مُردہ زمینیں سرسبز و شاداب ہوتیں۔ اب اُس کے یہ جلوے کہاں؟ "رشکِ قُرطبہ و بغداد" جسے جہان آباد ہونے کا فخر حاصل تھا خراب آباد ہو گئی وہ چمن مٹ گیا وہ بہار لُٹ گئی۔ وہ نظّارے جو کل نظر گرفتگی کرتے تھے آج خواب ہو گئے لیکن اِس "جہانِ خراب" میں اب بھی ایک گھر ہے جسکی تعریف میں ایک دفعہ مولانا حالیؔ نے مومن خاں مرحوم کے حسبِ ذیل شعر پر جیسہ کیا تھا ؎

آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں   رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام

حکیم شریف خاں مرحوم کا خاندان جس میں ایک مدت سے علم۔ اعزاز اور امارت یہ امتیازِ سہ گانہ متوارث چلے آتے ہیں۔ جو اَب بھی بزرگوں کے خصائل، بزرگوں کے باقیات الصالحات بزرگوں کے طور و طریق سنبھالے بیٹھا ہے۔ ایک مقتدر اور نہایت ہر دلعزیز خاندان ہے جس نے طبّی خدمات کے سلسلے میں علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے مُلک کی مستقل اور بیحد گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور "زندگی" اور "موت" کی ناگزیر مشکلات کم کرنے میں سلسلہ وار اور باقاعدہ جدّ و جہد یادگار چھوڑی ہے۔ ارسطو اور بو علی سینا کی دو بیت کو علم و عمل دونوں اعتبار سے اسی خاندان کی کوششوں نے حوادثات کے چُنگل سے بچایا۔ اور "اپنی مدد آپ" کا ایسا سدا بہار منظر دکھایا جو تمام عملی آدمیوں کی اُمیدوں کو شگفتہ اور ہمتوں کو مستحکم و استوار بناتا رہے گا۔ اُنہوں نے کوششیں صرف حفاظت و مدافعت کے پہلو تک محدود نہیں رکھیں بلکہ ترقی کو کامل وسعتِ مفہوم کے ساتھ مدِ نظر

رکھا۔ اور اس اعتبار سے جو ضرورتیں محسوس ہوئیں۔ اُن پر احاطہ کرتے رہے۔ طبِّ ہندی سے پیمانِ وفا باندھا۔ اُس کے اثرات زندہ کرنے کو مبسوط کتابیں لکھیں۔ درس و تدریس کے سلسلہ سے اور بالآخر قیامِ درسگاہ سے ہمدردی کے حقوق ادا کیے۔ اور نسلاً بعد نسلٍ اس قسم کی کوششوں کا تسلسل قائم رکھا۔ اور فرزندانِ وطن پر روشن کرتے رہے کہ عمرِ طبعی تک زندہ بچنے کی قدرتی خواہش کس طرح اپنے مرز و بوم کے وسائل سے اور اُن وسائل کے ترقی دینے سے پوری ہو سکتی ہے۔ اور کیونکر قدرت کی فیاضیاں اُس درجہ تک جس درجہ تک وہ ہمارے لیے عام اور سہل ہیں مفید اور سب ضرورتوں پر حاوی بنائی جا سکتی ہیں؟ اس خاندان کی تاریخ بلحاظ اِن خدمات کے جنہوں نے زندگی کے ایک سب سے اہم مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مُلک کے روبرو بڑے نمونے پیش کیے ہیں۔ بلحاظ تعزز اور منزلت کے جو دو مختلف طرز کی سلطنتوں میں یکے بعد دیگرے اُسے حاصل رہی بلحاظِ عام قدر و اعزاز کے جو بے غرضانہ خدمات کے صلہ میں مُلک کے ہر ملت و طبقہ کی طرف سے اُنہیں ملا ایثار کے لیے داعی اور محرک۔ فن کے لیے سبق اور ہدایت۔ اور ذاتی فضائل کو آراستہ کرنیکے لیے نمونہ ہو سکتی ہے اور اس لیے نہایت اہم اور مفید بھی ہے لیکن اُسے ایک علیحدہ رسالہ کے لیے اٹھا لیا گیا ہے۔

ذیل میں صرف اس "گروپ" کے متعلق جو آج مخزن کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ اور جس میں تین چار مستثنٰے اصحاب کے سوا باقی "خاندانِ شریف" کے موجودہ ممبر ہیں۔ چند سطریں لکھی جاتی ہیں تاکہ وہ حضرات جنھیں اس خاندان سے سابقہ تعارف نہیں معلوم کر سکیں کہ اس دَور میں یہ خاندان مُلک کی کیسی خدمات انجام دے رہا ہے اور آئندہ کن خدمات کے لیے تیار ہو رہا ہے۔

یہ "گروپ" فروری سنہ ۱۹۰۳ء میں حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں مرحوم کے صاحبزادوں کی شادی کی تقریب پر لیا گیا تھا۔ اگر حکیم غلام رضا خاں صاحب کی شبیہ اِس میں ہوتی جو فضل و کمال اور ورع و اتقا اور آئینِ "شرافت" کے بدو شعور سے بڑھاپے تک پابند ہونیکے لحاظ سے اپنے

خاندان میں فردِ کامل ہیں۔ تو جہاں تک موجودہ مشاہیر کا تعلق تھا یہ "گروپ" اس خاندان کی نسلِ موجودہ کا مکمل مرقع ہو جاتا۔ اس "گروپ" میں مقامِ صدر پر جو بزرگ نظر آتے ہیں حکیم حاجی غلام رسول خاں صاحب ان کا نام ہے۔ اب یہ اپنی دنیوی زندگی ختم کر چکے ہیں اور مہاجر ہیں۔ جب وطن کی کشش غالب ہوتی چلے آئے۔ ورنہ حجاز میں رہتے ہیں اور وہیں عمر بسر کرنی چاہتے ہیں۔ ان کے دائیں ہاتھ حکیم غلام نبی خاں صاحب ہیں کلکتہ جیسے مقام پر بعض تعلیم یافتہ لوگوں کو طبِ یونانی کا گرویدہ بنا لینا جو بالکل اُس سے مانوس نہ ہوں۔ انہیں کی حذاقتِ فن کا کام تھا۔ انہوں نے ایک مدتِ دراز تک نہایت کامیابی اور اعلےٰ اعزاز و منزلت کے ساتھ کام کرنیکے بعد ۶۲ برس کی عمر میں ۷۔ رجب ۱۳۲۵ھ ہجری کو انتقال فرمایا۔ اور چار لائق و فائق صاحبزادے یادگار چھوڑے جن میں سے حکیم عبد الغنی خاں جو اب اُن کے جانشین ہیں اسی سمت صدر کی نشست سے تیسرے نمبر پر ہیں۔ اور دوسرے حکیم عبد الرشید خاں بائیں طرف صدر کے چوتھے نمبر پر۔ حکیم غلام کبیر خاں جو اُنکے چھوٹے فرزند ہیں بستعدی اور قابلیت کے ساتھ تعلیم پوری کر چکے ہیں۔ اور امید ہے کہ مثل اپنے والدِ مرحوم کے کامیابی حاصل کرینگے ؎

حکیم غلام نبی خاں مرحوم کے برابر حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب ہیں۔ یہ نہ صرف اپنے خاندان کے صدر نشین ہیں بلکہ طبِ ہندوستانی کی جو رونق اب نظر آتی ہے انہیں کے دم سے ہے اور آئندہ ملک کی اس سب سے اہم ضرورت کا سر انجام بہت کچھ انہیں کی ذات سے وابستہ ہے۔ ہندوستان میں اوّل درجہ کے طبیب ہونیکے علاوہ بہت بڑے فاضل اور ادیب ہیں۔ عربی اور فارسی میں بے تکلفی اور بے ساختہ پن سے تحریر و تقریر کرتے ہیں۔ اور نہ معمولی نوشت و خواند بلکہ اعلےٰ درجہ کی علمی تصنیفات کر سکتے ہیں چنانچہ اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر انہوں نے بھی طبی لٹریچر پر نہایت مفید اضافہ کیا ہے۔ اور دولت اور طباعی کے علاوہ بہت عرصہ تک علمی زندگی بسر کرنیکے سبب ان کی علمی حیثیت میں جو شان

پیدا ہو گئی ہے اُس نے اِنکی علمی قابلیت سے مِلکر اِنہیں ملک کے لیے اِس درجہ مفید بنا دیا ہے کہ حالاتِ موجودہ کے لحاظ سے اُمید نہیں کہ قریب زمانہ میں اِن کی شان کا کوئی دوسرا شخص پیدا ہو۔ مدرسۂ طبیّہ جب اِن کے برادرِ بزرگ حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں مرحوم نے قائم کیا۔ یہ اُسی وقت سے اِس کام میں اُن کا دستِ راست تھے اب یہ اُسکے سکرٹری ہیں۔ اور اُسکی قسمت کا حل و عقد انہیں سے وابستہ ہے۔ اِسکے علاوہ بے زبان اور کس مپرس طبقۂ نسوان کی حالتِ زار کے لحاظ سے یہ ایک "دائیوں کا مدرسہ" اور ایک "زنانہ شفاخانہ" قائم کرنے والے ہیں۔ تاکہ نسوانی امراض میں عمدہ طبی امداد نہ ملنے سے جو دردناک حادثے ہوا کرتے ہیں موقوف ہو جائیں۔ اور زنانہ شفاخانہ میں غریب عورتوں کو وضع حمل کے زمانہ میں بلا معاوضہ مدد دی جائے۔ ہم نے خدا کے حکم اور تمدن کے اقتضا سب کو بالائے طاق رکھکر اپنی عورتوں سے اِس درجہ سرد مہری بلکہ میں جوشِ انصاف سے کہوں گا اِس درجہ ظلم جائز رکھا ہے کہ اِس غرض کے متعلق جو اپنی "ماؤں" "بہنوں" "بیٹیوں" اور "بیویوں" کا ہمارے اوپر ہے ہماری حس مُردہ ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے مہینے میں نہیں بلکہ پہلے سال کے بعد بھی یہ ضرورت نظر آتی ہے کہ حاذق الملک ہماری "رحم دل" سرکار کے بھروسے پر تحریک کی رفتار نہ چھوڑ بیٹھیں بلکہ اپنے اثر و اقتدار سے کام لیں۔ اطمینان یہ ہے کہ تحریک اُن کے ہاتھ میں ہے اور اُنکی پوری توجہ یہ بیڑا پار لگا کے رہے گی ؂

حاذق الملک نے حکیم شریف خاں مرحوم کا مقصد جو ویدک اور یونانی کے اتحاد پر مبنی تھا۔ اور جس نے مستقل کتاب اُن سے لکھوائی پورا کرنے کے لیے طبی کانفرنس کی بنیاد ڈالی ہے اور ویدوں اور طبیبوں دونوں کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم پیدا کیا ہے تاکہ اِس مشترکہ جد و جہد سے وہ تمام ضرورتیں رفع ہو جائیں جو اہلِ وطن کو بقائے زندگی کے لیے پیش آتی ہیں۔ اور "دیسی طب" ہر حیثیت سے مکمل اور مفید بن جائے ؂

یہ کام جن کا اُنہوں نے بیڑا اٹھایا ہے نہایت اہم اور ایثار طلب ہیں اور ہر ایک کا تقاضا یہ ہے کہ کوششوں کا مرکز اِسی کو بنا دیا جائے۔ لیکن جب بہت سی ضرورتیں جمع ہو جائیں اور اُن کا احساس بھی فقط ایک دل کا حصہ ہو۔ ناممکن ہے کہ دردمند طبیعت کو اُن میں سے کسی کا نظر انداز ہونا گوارا ہو جائے۔ حاذق الملک باوجودیکہ اُن کے پاس بہت تھوڑا فارغ وقت رہ گیا ہے اِن کاموں کو اپنے آرام پر بھی ترجیح دیتے ہیں اور اُنکیلیے بڑی محنت گوارا فرماتے ہیں۔ جب اُنکی پوزیشن وقعت اور ہر دلعزیزی پر نظر کیجاتی ہے جو اُنہیں ہندوستان بھر میں ممتاز بناتی ہے تو یہ کام اہمیت کے باوجود اِس قدر دشوار نہیں رہتے کہ اُن میں سے کسی کو ملتوی کرنے اور کسی کے لیے پوری محنت وقف کیے جانے کا مشورہ ناگزیر ہو۔

حاذق الملک اِن خدمات کے علاوہ اَور قومی کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ نمونہ ہے وقت کو سلیقے سے استعمال کرنے کا اور سچّے ایثار علی النفس کا۔

صاحبِ صدر کے داہنے ہاتھ پر حکیم واصل خاں مرحوم ہیں۔ یہ فخرِ خاندان تھے اور اپنے وقت میں اتنا کام کر گئے ہیں جو اُن کا نام ہمیشہ خاندان کے اُفق پر روشن رکھے گا۔ طرزِ علاج میں یہ بالکل اپنے والد حکیم محمود خان مرحوم کا تتبع کرتے تھے اور جو شفا اِس طبیبِ اعظم کے ہاتھوں میں تھی اُسیکا حصہ انہیں عطا ہوا تھا۔ افسوس ۸۔ فروری ۱۹۰۵ء کو بے مہریِ قضا نے اِن کا چراغِ زندگانی وقت سے پہلے گل کر دیا۔ اِن کے برابر حکیم حاجی احمد سعید خاں صاحب ہیں۔ یہ آنریری مجسٹریٹ، میونسپل کمشنر اور دلّی کے میونسپل بورڈ کے وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ اِنھوں نے حاذق الملک حکیم عبد المجید خانِ مرحوم کے آگے زانوے ادب تہ کیا اور بمبئی میں بہت کامیابی کے ساتھ فنِ شفا کا فیض جاری رکھا۔ صاف۔ باطن۔ متواضع اور متدیّن آدمی ہیں۔ امسال بعض دوسرے ابنائے خاندان کے ساتھ فریضۂ حج ادا کرکے آئے ہیں۔ اور اِس موقع پر شہر نے بلا اختلاف مذہب و ملّت اِن کا اِس دھوم سے استقبال کیا کہ لوگوں کا بیان ہے کہ گزشتہ نصف صدی کے بعد کسی قافلہ حجاج کا اِس قدر شاندار

استقبال دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ اِن کی اور اِن کے خاندان کی وقعت اور ہر دلعزیزی کا فقط ایک نظارہ تھا۔ اِن کے قریب حکیم فاضل خاں صاحب بیٹھے ہیں۔ جنہوں نے طبی تعلیم حکیم غلام رضا خاں صاحب کے حلقۂ درس میں تمام کی اور اپنے فن سے فطری مناسبت ہونے کے باعث جو کچھ سیکھا اُسکا نہایت کامیابی سے استعمال کیا۔ اِن کی خدمات بہت اعزاز کے ساتھ بعض ریاستوں سے متعلق رہیں۔ اِستادہ صف میں بائیں طرف سے چھٹے نمبر اور صدر کے ٹھیک عقب میں حکیم حاجی محمد احمد خاں ابن حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں مرحوم ہیں انہوں نے تعلیمی جدوجہد ختم کرلی ہے اور دوران تعلیم سے والد اور چچا کے زیر نگرانی فن کے متعلق اسرار و نکات حاصل کر رہے ہیں۔ قابلیت کے ساتھ روشن خیالی اور جدت پسندی اور وہ تمام اوصاف جو انہیں "اولد سرٌ لابیہ" کا مصداق ثابت کر رہے ہیں انہیں مبدأ فیاض نے عطا کیے ہیں۔ طب ہندی کی وہ شاخ جو اِن کے خاندان کی طبابت کو پوری دنیا طبابت ثابت کرتی رہی ہے۔ اِس کی طرف انہیں ذاتی شغف ہے اور وہ اِس کے متعلق محنت و استقلال سے تجربے اور علم کو وسعت دینے میں مصروفِ سعی ہیں۔ اِن کے خاندان اور خصوصاً اِنکے والد کے (جو بلاشبہ آسمان طب کے آفتاب تھے) بے شمار دوستوں کو نہایت مسرت ہے کہ انہوں نے وہ لیاقتیں جو دورِ آئندہ میں اِس خاندان کی ممتاز صفتوں کے قائم رکھنے کی ضمانت ہو سکتی ہیں۔ توجہ محنت اور ذاتی دلچسپی سے پیدا کریں +

ان کے برابر اِن کے چھوٹے بھائی حاجی ظفر حسین خاں ہیں۔ یہ ابھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور جو خصائل اِن سے ظاہر ہوئے۔ اُن سے اُمید ہوتی ہے کہ جس طرح شباہت اور کیریکٹر میں اپنے والد کی تصویر ہیں۔ اسیطرح علم و فضل اور صفاتِ خلق کے لحاظ سے اُن کے خلف الرشید ثابت ہوں گے۔ اِن کے پیچھے غلام رسول خاں ہیں اور اِنکے برابر حکیم غلام کبریا خاں ہیں۔ اِنہوں نے دورانِ تعلیم میں غیر معمولی ذہانت اور فراست ظاہر کی ہے یہ حکیم حاجی احمد سعید خاں کے فرزند اور حکیم محمود خاں مرحوم کے نواسے ہیں۔ حاذق الملک

حکیم محمد اجمل خاں کی نگرانی میں انہیں نہایت اعلیٰ تعلیم دی گئی ہے۔ اور بدوِ شعور سے ہونہار دیکھکر اس اہتمام سے ان کی تربیت کا فرض پورا کیا گیا ہے کہ آیندہ بہتر فرائض خاندان جو انہیں ملنے والے ہیں پوری کامیابی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ حکیم محمد احمد خاں اور یہ نئے دور کے لیے دو نوجوان ہیں۔ جن کی ذات سے طبِ ہندوستانی کی امیدیں ضمیموں اور حواشی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ مطالعہ پسند اور معلومات میں ہمیشہ اضافہ کی کوشش کرنے والے ہیں۔ اور ممتاز خاندانی خصائل اور کمالات کی موجودگی نے ان کا مستقبل بہت صاف اور روشن بنا دیا ہے ؂

ان کے قریب حکیم محمد نصیر خاں صاحب ہیں جو بمبئی میں مطب کرتے ہیں اور قابلیت کے علاوہ مہر و وفا میں اپنے خاندان کا ایک نمونہ ہیں۔ بچوں کی صف کے عین وسط میں جو چھوٹی شبیہ نظر آتی ہے۔ محمد جمیل خاں ابن حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں ہیں جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس اہتمام کے ساتھ جس کی سلسلہ تعلیم کے انکے والد جیسے مبصر سے اُمید ہو سکتی ہے ؂

عبدالقدیر دہلوی

محبت فرزندی! اسکندر اعظم کی ماں اوجمپیا ایسی تندخو و تنگ مزاج تھی کہ وہ معاملات سلطنت میں اس سے کسی طرح کام نہیں لے سکتا تھا۔ لیکن اوجمپیا دوسروں کی حرکات و سکنات کو تاڑتی رہتی تھی۔ اور اپنے بیٹے سے تمام آدمیوں کی شکایتیں کیا کرتی تھی۔ سکندر ماں کے مزاج سے بخوبی آگاہ تھا۔ مگر اُسکی شکایتوں کو خوب دل لگا کر سُنتا اور بلطائف الحیل اُسے ٹال دیتا تھا۔ ایک بار اینٹی پیٹر نامی نائب السلطنت یوروپ نے سکندر کو ایک طویل عرضداشت بھیجکر اوجمپیا کے دخل درمعقولات کی شکایت کی مگر سکندر نے اسکے جواب میں لکھا کہ "کیا تجھے خبر نہیں کہ میری والدہ کا ایک آنسو ایسی ہزار چٹھیوں کو دھو ڈالتا ہے" ؂

گسائیں تلسی داس جی

رامایَن کے نامور مصنف کی تصویر جو گزشتہ پرچے میں شائع ہو چکی ہو وہ ہمیں جناب پیارے لال صاحب شاکر نے اِس دلچسپ مضمون کے ساتھ عنایت کی تھی جو اِس مرتبہ شائع ہوتا ہی۔ جناب شاکر کی تلاش داد کے قابل ہی۔ مضمون اور تصویر دونوں کے لیے ہم اُن کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں ۔

گسائیں تلسی داس جی ذات کے برہمن اور موضع راجپور ضلع باندہ کے متوطن تھے۔ اِنکے والد کا نام **آتمارام دُوِیدی** اور والدہ کا نام **ہولاسی** تھا آپ کی پیدائش سمت ۱۵۸۹ میں ہوئی چونکہ ہندو شاستروں کی رو سے آپکا وقت پیدائش ایک ایسی گھڑی تھی کہ مولود کو ہمیشہ کے لیے گھر سے نکال دیا جائے۔ لہذا آپکے والد نے جو اپنے مذہب کے ایک پکے معتقد تھے۔ اُن کو باہر پھنکوا دیا۔ **مہاتما نرسنگھ داس** سادھو نے اُنکو اُٹھا کر اپنے [illegible]س منگوا لیا۔ اور اچھی طرح سے اُن کی پرورش کی۔ اور جب ذرا ہوشیار ہوئے تو "گرو وکشا" دیکر اُنکو اپنا شاگرد بنالیا اور اُن کا نام **تلسی داس** رکھا۔ اِس سے پیشتر وہ ہمیشہ اُنکو **رام بولا** کے نام سے پکارا کرتے تھے ۔

اُن دنوں ایک مشہور پاٹھک **مہاتما دین بندھو** قریب ہی رہا کرتے تھے اُن کی بیٹی **رتناولی** نہایت خوبصورت اور نازک بدن تھی۔ باپ کی تعلیم و تلقین نے لڑکپن ہی سے اُسکے دلمیں ایک اچھا بیج بو دیا تھا۔ اِس نیک تربیت کے باعث وہ ایک خدا پرست لڑکی بن گئی تھی۔ جب بالغ ہوئی تو باپ کو اُسکے شادی بیاہ کی فکر ہوئی۔ اُدھر **گسائیں تلسی داس جی** بھی سن بلوغت کو پہنچ چکے تھے۔ ایک آدمی کو درمیان میں ڈالکر گسائیں جی نے اپنا عندیہ مہاتما **دین بندھو** پر ظاہر کیا۔ اُنھوں نے یہ درخواست منظور کر کے نہایت دھوم دھام کے ساتھ دونوں کی شادی کر دی۔ حق یہ ہے کہ یہ جوڑا ایسا اچھا بندھا کہ اسکی نظیر بہت کم

دیکھنے میں آتی ہے۔ ایک عالم اور خدا پرست شخص کو جو خوشی ایک تربیت یافتہ اور نیک بیوی کے ملنے سے ہوتی ہے اُسکا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے مہاتما **دین بندھو** جی بھی ایک قابل داماد ملنے کے باعث از حد خوش تھے۔ نیک **رتناولی** ہمیشہ شوہر کی خدمت و پاسداری میں مشغول رہتی تھی۔ گسائیں جی کو بھی اُن سے اسقدر الفت و محبت تھی کہ دم بھر کو بھی اُنہیں اپنے پاس سے جدا نہ کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد خدا تعالیٰ نے ان کو اولاد نرینہ عنایت فرمائی کہ جسکا نام **تارک** رکھا گیا۔ اس آلہی بخشش سے اُن دونوں کا رشتۂ الفت اور بھی زیادہ مضبوط ہو گیا۔ رتناولی کے والد نے کئی بار اُسکے بلانے کو آدمی بھیجا۔ مگر گسائیں جی نے اُسکی جدائی کو منظور نہ کیا۔ آخر کار **رتناولی** کا بھائی اُسے اپنی ہمراہ گھر لے جانے کے لیے آیا۔ اس دفعہ اُس نے خود بھی اپنے باپ کے گھر جانے میں زور لگایا مگر گسائیں جی بالکل راضی نہ ہوئے۔ اتفاقاً کسی کار ضروری کے لیے گسائیں جی کو باہر جانا پڑ گیا۔ **رتناولی** بلا اجازت اُنکی عدم موجودگی میں بھائی کی ہمراہ باپ کے گھر روانہ ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد گسائیں جی واپس آئے **رتناولی** کو وہاں موجود نہ پا کر سخت بیکل ہوئے۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈھا۔ کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر آس پاس کے رہنے والوں سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے باپ کے گھر چلی گئی ہے۔ گسائیں جی تابِ مفارقت نہ لا کر فوراً سُسرال کی طرف روانہ ہو پڑے۔ **رتناولی** ابھی رشتہ داروں سے اچھی طرح ملنے بھی نہ پائی تھی کہ گسائیں جی بھی جا پہنچے۔ اُن کو دیکھکر وہ بہت شرمندہ ہوئی۔ جھنجلا کر خوشامدانہ لہجہ میں بولی:۔

"پران ناتھ! جو محبت تمکو مجھسے اور میرے ناپائدار جسم سے ہے۔ اگر یہی محبت شری رام چندر جی سے ہوتی تو دین دنیا دونوں کو کما لیتے"۔

گسائیں جی ایک گیانی پنڈت تھے۔ اُنکے دل پر یہ بات تیر کی طرح لگی۔ اور کچھ عرصہ کی بجھی ہوئی آگ ایک دم چمک اُٹھی سفوراً تمام تعلقات دنیوی پر لات مار کر کاشی جی (بنارس) کی طرف روانہ

ہوگئے۔ اور وہاں پہنچکر دن رات یادِ الٰہی میں گمن رہنے لگے ٭

گسّائیں جی کی زندگی کا سب سے بڑا اور مشہور واقعہ یہی ہے کہ جس نے آن کی آن میں اُنکی کایا پلٹ دی۔ عورت کی ایک ذراسی بات نے اُن کے دل کو ہمیشہ کے لیے دنیا سے موڑ دیا۔ اور رفتہ رفتہ اُسکا یہ نتیجہ نکلا کہ **راماین** جیسی مشہور و معروف کتاب آج دنیا میں موجود ہے۔ یہ وہ نہ مٹنے والی یادگار ہے جو ہزاروں دلوں میں گھر کیے ہوئے ہے ٭

ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں جو ہردلعزیزی اور شہرت **راماین** کو حاصل ہے وہ کسی اور کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ کہنے کو وہ ایک مہاراجہ کی سوانح عمری ہے مگر اسمیں فرائض کے ایسے بہترین نمونے پیش کیے گئے ہیں کہ جنکی نظیر مشکل سے ملیگی۔ اسمیں اُس زندگی کی تصویر کھینچی گئی ہے جو قدیم آریوں کی نگاہ میں مکمل کہلاتی تھی۔ کچھ شک نہیں کہ ہندو اس کتاب کے صد درجہ زیر بار احسان ہیں۔ کوئی ہندو خواہ کسی فرقہ یا گروہ کا ہو ایسا نہ ملیگا جسنے **راماین** کو پڑھا یا سُنا نہو اور اُسکے دل پر اُسنے ایک نیک اثر [illegible] ڈالا ہو۔ یہ درست ہے کہ **راماین** ایک قصہ ہے۔ مگر در اصل یہ وہ بے نظیر قصہ ہے کہ جسکے مطالعہ سے پڑہنے والے کے دلمیں وسیع خیالات سرایت کرجاتے ہیں۔ اور وہ اوصاف جو کمالاتِ انسانی کا زیور ہیں ہمارے سامنے آکر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ راستبازی۔ ایفائے عہد۔ فرزندانہ اطاعت۔ پدرانہ محبت و حلم۔ استقلال۔ عفو غرضیکہ کوئی ایسی خوبی نہیں جسے جادو نگار شاعر نے نظرانداز کردیا ہو مگر وہ بات جسکے باعث دیگر اقوام و مذاہب کے لوگ بھی **راماین** کو اپنے دلوں میں ایک اچھی اور ممتاز جگہ دیتے ہیں یہ ہے کہ اُسنے **ہندو علم ادب** کا ایک اعلیٰ نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اور یہ **کامیابی** کچھ شاعرانہ بلند پروازی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اسکے مصنف کی غیر معمولی قابلیت اور دیگر خداداد عطیات کی بدولت ہے گر لفیتھ صاحب کا یہ قول کہ "راماین دنیا میں ہر وقت و ہر ملک کے علم ادب کو برابر کامیابی کے ساتھ چیلنج دیتی رہیگی اور انسانی کمال کی یہ مکمل تصویر جو راماور سیتا میں نظر آتی ہے کہیں اور نہ ملیگی"۔ ایک حد تک درست ہے ٭

گُسّائیں تلسی داس جی کے باب میں مؤلف رہنمایان ہند نے لکھا ہی کہ وہ شروع شروع میں راجہ صاحب بنارس کے دیوان بھی رہے ہیں اور بعد ازاں فقر و زہد اختیار کرکے بندرابن کو چلے گئے۔ بہت سے مقامات کا سفر کیا اور پھر بنارس میں واپس آئے۔ اور یہیں پر رامائن لکھی۔ اور اواخر زندگی کا حصہ بھی اسی متبرک شہر میں گزارا۔

اگر گُسّائیں جی کے چہرے کو غور سے دیکھا جائے تو ماہرین علم فزیالوجی کے قائم کردہ اصولوں کی رو سے معلوم ہوگا کہ آپ کی قوتِ ادراک بہت بڑھی ہوئی تھی اور یہ وہ نعمت ہی جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔

کہا جاتا ہی کہ شری رگھنبد جی نے گُسّائیں جی کو خواب میں حکم دیا کہ وہ رامائن کو قلمبند کریں۔ چنانچہ اُنہوں نے سمت ۱۶۳۱ میں رامائن لکھنی شروع کی۔ بال کانڈ میں اسکے شروع کرنیکی تاریخ لکھتے ہیں ؎

سمبت سولہ سو اکتیسا ۱۶۳۱ کروں کتھا ہری پد دھر سیسا نومی بھوم وار مدھو ماسا اودھ پوری یہ چرت پرکاشا

گُسّائیں جی بھاکا زبان کے شاعروں میں بہت ممتاز مانے جاتے ہیں۔ انکی لکھی ہوئی رامائن کی دو تحریریں اب بھی متبرک سمجھی جاتی ہیں۔ ایک تو انکے وطن راجپور میں ہے اور دوسری شری سیتارام جی کے مندر بنارس میں۔ ایک اور بہت پُرانی کتاب مہاراجہ کاشی کے پاس بتائی جاتی ہی۔ مگر اسکی نسبت یہ بھی خیال کیا جاتا ہی کہ وہ گُسّائیں جی کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ انکی وفات کے چوبیس ۲۴ برس بعد یعنی سمت ۱۷۰۴ میں انکے خودنوشت نسخے سے نقل کیگئی ہے۔ گُسّائیں جی کی تصانیف اسقدر ہیں (۱) کبت رامائن (۲) رام گیتاولی (۳) دوہاولی (۴) بنے پترکا (۵) کرشن گیتاولی (۶) رام ست سئی (۷) رام لتا (۸) نہلو (۹) بیراگ سندیپنی (۱۰) بروا رامائن (۱۱) کنڈلی رامائن (۱۲) رولا رامائن (۱۳) کرکھا رامائن (۱۴) جھولنا رامائن (۱۵) پاربتی منگل (۱۶) جانکی منگل (۱۷) سنکٹ موچن (۱۸) ہنومان باہک (۱۹) رام شگناولی

گُسّائیں جی نے اسّی گھاٹ بنارس میں ۹۱ برس کی عمر میں یعنی سمت ۱۶۸۰ میں وفات پائی جیسا کہ اس دوہے سے معلوم ہوتا ہی دوہا سمبت سولہ سو اسی ۱۶۸۰ اسی گنگ کے تیر۔ شراون شکلا سپتمی تلسی تجیو شریر۔

ہم نے بہت کوشش و تجسس سے کام لیا مگر افسوس کہ گُسّائیں جی کے کچھ اَور حالات دریافت ہوسکے دو ایک کتابیں تلاش کیں مگر وہ ایسے بیانات سے پر ہیں کہ ہمارے دل نے اُنہیں صحیح تسلیم نہیں کیا۔ ہیر دو شرب

شیر و شکر

واعظِ خوش بیان۔ طوطیِ ہندوستان۔ مولانا مولوی حافظ محمد عبد الرحمٰن صاحب راسخ مرحوم دہلوی نے ایک صاحبِ دل کے خیالات جو سفید کاغذ پر سیاہ حروف دیکھکر ان کے دل میں گزرے پُرازعرفان نثر میں لکھے ہیں۔ مولانا مرحوم کے حقیقی بھتیجے زادہ بھائی حافظ محمد عبد القدوس صاحب قدسی وکیل ریاست بہاولپور نے ان پاکیزہ خیالات کو نظم کیا ہے اور اس مجموعہ کا نام شیر و شکر رکھا ہے۔ اسلئے ہم اسی عنوان سے نثر و نظم دونوں کو شائع کرتے ہیں۔

ایک **صاحبدل** نے سفید کاغذ پر سیاہ حرف لکھے دیکھے۔ کاغذ سے پوچھا کہ تو کس بلاؤ مصیبت میں مبتلا ہو کر سیاہ پڑ گیا ہے۔ تجھپر ایسی کیا بن گئی ہے؟ اچھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ **کاغذی** نے تجھپر ظلم کیا ہے۔ پہلے تجھکو کوٹا پیٹا۔ پھر پانی میں ڈبویا۔ پھر دیوار پر دے مارا بعدہٗ تیرا بند بند جدا کر دیا۔"

صاحبدل

ایک **صاحبدل** کا فرضی ماجرا لکھتا ہوں میں — چند اسرارِ نہاں کو آج کرتا ہوں عیاں
ہوتے ہیں ایسے فروتن ہی فرا عالی خیال — خود زمیں پر، فکرِ عالی وقفِ سیرِ آسماں
دیکھا قرطاسِ سفید اک اُسپہ کچھ حرفِ سیاہ — دفعتہً اُٹھا میانِ قلبِ مضطر سے دھواں
پوچھا **کاغذ** سے کہ تجھپر کیا بنی اے سیمتن — ماہ رو! ابرِ سیہ میں تو ہوا کیوں کر نہاں
ہاں کیا ہی **کاغذی** نے تجھپہ شاید یہ ستم — کوٹا پیٹا پہلے۔ پھر دریا میں ڈالا ہے میاں!
پھر نکالا واں سے۔ اور دے مارا اک دیوار پہ — بند بند اُس نے جدا کر کے بنایا نیم جاں

کاغذ

بیشک کاغذی نے مجھکو ستایا ہے تکلیف دی ہے۔ مگر میں یہ تکلیفیں نہ جھیلتا تو درباریوں میں داخل نہو سکتا۔ تکلیف ہی کی بدولت میں بادشاہ کا مصاحب بن گیا ہوں

پسِ تکلیف ہو جاتے ہیں عاشق آگاہ بے تکلیف — گدائے شاہ رہتا ہے حضورِ شاہ بے تکلیف
یہ تکلیفات دیتی اہلِ دل کو راحتِ جاں ہیں — مطیعانِ نبی رہتے نہیں واللہ بے تکلیف
الٰہی کس مزے کا عشق ہے تیرا کہ خود عالم — کھنچا جاتا ہے تیری سمت بے اکراہ بے تکلیف"

کاغذ

بولا قرطاسِ مصفا سچ کہا اے نیک دل — کاغذی نے کر دیا مجھکو ضعیف و ناتواں
مجھکو تکلیفیں بہت پہنچی ہیں اُسکے ہاتھ سے — پر نہ سہتا انکو تو دربار میں ہوتا کہاں ؟
جا رہا ہوں ان مصائب کی بدولت شاہ تک — بن گیا میں اب مشیرِ بادشاہِ نکتہ داں
سچ تو یہ ہے بے تعب پھل نہیں ملتا ہے کچھ — تاؤ کھا کر ہوا ہے سکۂ شاہی رواں

صاحبدل

شاید جلدگر نے تجھپر ستم کیا ہے کہ سیفے سے تجھکو کاٹا۔ اجزا جدا جدا کیے۔ شکنجے میں کھینچا۔ بازاروں میں پھرایا۔ تو اس رنج سے سیاہ ہو گیا ہے"۔

صاحبدل

ہاں تو مارا جلدگر نے تجھکو بے تقصیر آہ — کاٹ کر سیفے سے اجزا کر دیے تیرے عیاں
پھر شکنجے میں کسا۔ کھینچے پھرا بازار میں — اسلیئے چہرے پہ تیرے ہے سیاہی کا نشاں

"کاغذ

مجھپر یہ ظلم نہ کاغذی نے کیا ہے نہ جلدگر نے۔ یہ سب مہربانی سیاہی یعنی روشنائی کی ہے۔ اُس سے پوچھو"۔

کاغذ

کاغذی نے کچھ کیا نے جلدگر نے کچھ کیا — سب عنایت روشنائی کی ہے یہ اے مہرباں

پوچھتا ہے آپ کو گر کچھ تو اُس سے پوچھیے — کر دیا جس نے سوادِ الوجہ سب کو ناگہاں

ضُاجمل

اے سیاہی تو تو چراغ کی اولاد ہے۔ تجھکو نور پھیلانا چاہیئے نہ کہ سیاہی۔ اے سیاہی تو تو گوشہ نشینِ دوات۔ اور صوفی (صوف والی) ہے۔ صوفی ہو کر ایسا ظلم۔ اور شب چراغ کی اولاد ہو کر ایسا اندھیر کہ کاغذ کو سیاہ کر دیا۔ خدا کے روبرو جانے سے شرماتے ہیں ڈرتے ہیں !! جو روشن ضمیر ہیں ایسا کبھی اندھیر کرتے ہیں *

ضاجمل

اے سیاہی روشنائی تھی تو اولادِ چراغ — تو کی جا تو نے کیوں باندھا ہی ظلمت کا سماں
آسمانِ رخ پہ تیرے چھا گئی کالی گھٹا — ہو گئی صورت ہی مسخ اب الحفیظ و الاماں
حیف اے روشن ضمیر افسوس اے آبِ قرش — مہرِ تاباں ہوکے تو کیوں بن گئی زُلفِ بتاں
تھی تو اک گوشہ نشینِ خانۂ چشمِ مداد — تو لباسِ صوف میں گویا تھی تصوف کی زباں
اے خدا نا ترس کاغذ پر یہ جور نا روا — کیوں جشش میں [illegible] کی اتھا کیوں زباں

سیاہی

میں نے جب سے سیاہی سانس کے وقتوں تکلیف پائی ہے۔ گوشہ نشین ہو گئی ہوں۔ دوات کو اپنا حصار سمجھ لیا ہے۔ میں نے نیت کر لی تھی کہ اپنا کالا منہ کسیکو نہ دکھاؤ نگی۔ مگر کیا کروں قلم نے نیزے مار مار کر مجھے گوشۂ عافیت سے نکالا۔ اور کاغذ پر ظلم کرنے کی بابت کلنک کا ٹیکا میرے ماتھے پر لگا دیا۔ یہ گناہ قلم کا ہے اُس سے پوچھیں *

سیاہی

پھوٹ کر جو سیاہی گرے ہوں عزلت گزیں — جانتی ہوں ہے دوات اپنا حصار و حصنِ جاں
میری نیت میں تھا کالا منہ نہ دکھلاؤں کہیں — پر کروں کیا مار کر نیزے [illegible]
گوشۂ [illegible] سے کھینچ لایا ہے مجھے — اور کلنک اپنا لگایا بے گنہ [illegible] برم [illegible]
یہ گنہ سراسر قلم کا ہے اُسی سے پوچھیے — ورنہ میں ہوں ضعیف ایسا [illegible] تو تھی کہاں

ضُاجمل

اے قلم! "ن والقلم" کا تاج تیرے سر پر رکھا گیا۔ اور "سیف و قلم توامان" کا پٹکا تیری کمر سے باندھا گیا۔ بااینہمہ تُو نے سیاہ پوش صوفی کو اُسکے حجرے سے نکالا۔ اُس کا اعتکاف توڑ دیا"

صاحبدل

اے قلم! ہی سر پہ تیرے تاج نونِ والقلم   اور ہے سیف و قلم کا توأماں تجھ پہ نشاں
باوجود ایسے فضائل کے کیا تُو نے ستم   ایک صوفیِ سیہ پوش اے سخن فخار
تُو نے حجرے سے نکال اُسکو کیا آوارہ گرد   توڑ ڈالا اعتکاف اُس کا یہ جورِ بیکراں؟

قلم

"میں تو نہروں کے کنارے کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ مجھے اِس صوفی کے آزار کا خیال نہ تھا۔ مگر افسوس کاٹنے والے کے ہاتھ نے مجھے کاٹا۔ میری نوک کو نوکِ سناں بنایا۔ اور دوات پر ظلم کیا۔ ہاتھ سے پوچھیے"

قلم

میں لبِ جوئے چمن استادہ مصروفِ نماز   ہر گھڑی رہتا تھا محوِ طاعتِ جانِ جہاں
دھیان بھی آتا نہ تھا اِس پاک طینت کا کبھی   دفعتًہ مجھکو بنایا دستِ قاطع نے سناں
اور سناں بھی وہ کہ ہو جائے جگر کے آر پار   بزم کی جاں۔ رزم میں نوکِ سنانِ جانستاں
ہاتھ سے حضرت اگر پوچھیں تو ہو کچھ وہ تنگ   پوچھتے ہو مجھ سے کیا اے سرگروہِ عارفاں

صاحبدل

"اے ہاتھ تیری انگلی میں قوت و سلطنت کی انگشتری ہے۔ تمام اعضا میں تو زبردست ہی پھر زیردست قلم پر یہ ظلم"

صاحبدل

ہاتھ لا اے ہاتھ! میں ہیہات تجھ سے کیا کہوں   تُو نے اِک صحرا نشیں عابد کو پہنچایا زیاں
تیری انگشتِ قوی میں مُلک کی انگشتری   وہ انگوٹھی جسکو کہیے خاتمِ پیغمبراں
تھی وہی مُہرِ سلیماں۔ اور نگینِ سلطنت   اُس کو رہنا چاہیے تھا بن کے مثلِ سائباں
زیردستوں پر زبردستوں کے ہوتے ہیں کرم   تُو نے کیوں برعکس اسکو کر دیا اے پہلواں

پر ستم کا کیوں قلم کر ہی دیا تُو نے قلم — اور اِس فعلِ قبیح سے ہی اپنے شادماں

ہاتھ

"میں تو گوشت یا پوست ہوں۔ مجھ میں طاقتِ قطع و برید کہاں؟ یہ کام صاحبِ دست کی طاقت نے کیا ہے۔ طاقت سے پوچھیے"

ہاتھ

پوچھیے گا صاحبِ ید جنابِ من یہ حال — اور بازو سے بنا ہوں جسکے میں تُکل کہاں
ورنہ میں خود کیا ہوں بس اک لوتھڑا سا گوشت کا — ارتکابِ جرم میں طاقت کا لیجے امتحاں

صاحبدل

"اے طاقت! تُو نے ہاتھ کو تکلیف کیوں دی۔ محتاج کو کیوں ستایا؟"

صاحبدل

طاقت!۔ اے سرپنجہ فولاد۔ ہاں جلدی سے بول — دست کو بیدستہ یا تُو نے بنایا کیوں یہاں؟
اُسکے پیچھے ایسی پنجے جھاڑکر تُو پڑ گئی — حال پر اُسکے ہیں سب انگشت حیرت دنداں

طاقت

"میری کیا مجال۔ کہ کسیکو نفع یا نقصان پہنچا سکوں بلکہ مجھکو ارادہ نے مجبور کر رکھا ہے۔ یعنے ارادہ انسانی کا اتباع کیا ہے۔ یہ سوال ارادہ سے ہو"

طاقت

میرا کیا مقدور جو ہل ہی سکوں میں خود بخود — ہاں ارادہ نے کیا مجبور مجھکو مہرباں
عزمِ انسانی کی تابع رہتی ہوں آٹھوں پہر — آپ ارادہ کا قلمبند آج کیجے بیاں

صاحبدل

"اے ارادے! تُو نے طاقت کو کیوں ابھارا کہ اُس نے ہاتھ پر اور ہاتھ نے قلم پر ظلم کیا"

صاحبدل

اے ارادے! تُو نے طاقت کو ابھارا کس لیے — بیٹھے بیٹھے تیرے فتنوں نے اُٹھایا آسماں

جا پڑا تو ہاتھ پر اور ہاتھ پہنچا تا قلم — ہم کہیں کیونکر نہ تجھکو بانیٔ ظلم نہاں

اُرادہ

میرے رہنے کی جگہ دل ہے - بغیر دل کی تحریک کے میں کچھ نہیں کر سکتا. دل سے پوچھو"

ارادہ

میرے رہنے کی جگہ ہے بارگاہِ قلب میں — منقلب میں انقلابِ دل سے ہوتا ہوں میاں!

آپ دل سے پوچھیے - بیلاغ کیجیے آپ مجھے — میں ہوں بے تقصیر ہے اسپر ہی سب بارِ گراں

صاحبدل

اے دل! تو نے ارادے کو قلم کاٹنے پر کیوں مجبور کیا - تو رئیس الاعضا ہے۔ امیر و رئیس انصاف کرتے ہیں - نہ کہ ظلم"

صاحبدل

تو ہے اے قلبِ بشر! اعضا میں اک عضوِ رئیس — ہو کے عالیجاہ تو نے کیا کیا یہ ناگہاں

ہوتے ہیں اہلِ ریاست معدلت گستر بہت — پر ترا شیوہ رعیت کو ہوا ایذا رساں

دل

اے سلیم القلب! تجکو معلوم نہیں کہ میں قلب ہوں - مگر مقلب القلوب کوئی اور ہے ؎

اہلِ دل را خدائے بخشندہ — دادہ بود - از کرم زبانِ مقال

بر کرم صد کرم زیادت کرد — داد او را چنیں لسان الحال"

دل

اے سلیم القلب! گو کہتے ہیں مجکو قلب سب — ہے مقلب میرا لیکن اور ہی کوئی نہاں

آنکھوں ہی آنکھوں میں بس اسکو سمجھ لیجے حضور — چھپکے ہی چھپکے اسے پہچان لیجے مہرباں

بات دل کی ہو - بس دل ہی میں رہنے دیجیے — آگے عرضِ حال کی مجھ میں کہاں تابِ بیاں

تھی زبانِ حال کی کچھ مختصر سی گفتگو — بات بڑھتے بڑھتے پہنچی ہے کہاں سے اب کہاں

عبد القدوس قدسی

ریویوز

جناب مولوی عبد اللہ خاں صاحب سابق سیکنڈ ماسٹر سنٹرل موڈل سکول لاہور حال ممبر پنجاب ٹیکسٹ بک ریویژن کمیٹی لاہور اس بات پر اُردو خواں حصہ آبادی کی طرف سے خاص تحسین و شکرگزاری کے مستحق ہیں کہ اپنی فرصت کا وقت اُنہوں نے ایسی کتابوں کی تالیف و اشاعت میں صرف کیا ہے جو تعلیم کے مختلف مضامین پر مشتمل اور بچوں کے لیے بہت کچھ کارآمد و دلچسپ ہیں حال میں ماسٹر صاحب موصوف نے اپنی چند کتابیں بغرض اظہار رائے دفتر مخزن میں ارسال کی ہیں۔ اُن میں سے (۱) **حساب کا قاعدہ** ہے جس میں ایک سے سو تک گنتی سکھانے اور ہندسے لکھنے اور پڑھنے کا ایسا سہل طریق بتایا گیا ہے کہ پانچ چھ سال کی عمر کے بچے تمام اعداد و اعداد کے اجزائے ترکیبی کو بخوبی ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ ہر عدد کے ساتھ جمع تفریق ضرب تقسیم کے آسان و ضروری عمل بھی درج کیے گئے ہیں اور بڑے بڑے نقطوں اور مربع خانوں کے نقشے دیے گئے ہیں تاکہ بچے ہر ایک ہندسہ کی مقررہ مقدار کو ہر پہلو سے سمجھ سکیں اور حساب کے ابتدائی و بنیادی اصول میں کبھی غلطی نہ کریں۔ اس قاعدہ حساب کی ضخامت مع سرورق و دیباچہ وغیرہ تین جزو ہے قیمت ۲ر (۲) **عجیب و غریب لطیفے حصہ اول**۔ اس میں بچوں کی تفریح طبع کے لیے ۵۴ دلچسپ لطیفے مندرج ہیں۔ لطیفے اکثر وہی ہیں جو عام زبانوں پر مذکور ہیں مگر اُنکے جمع کرنے میں اس امر کی پوری احتیاط رکھی گئی ہے کہ کوئی لفظ یا فقرہ یا کنایہ ایسا نہ آنے پائے جس سے معصوم بچوں کا ذہن کسی منافی اخلاق یا خلاف تہذیب بات کی طرف منتقل ہونے کا اندیشہ ہو عبارت بھی سلیس و آسان ہے۔ تقطیع۔ لکھائی۔ چھپائی سب بچوں کے لیے موزوں اور قیمت صرف ڈیڑھ آنہ ہے

(۳) **حکایات عجیب**۔ ۲۹ دلچسپ و نتیجہ خیز حکایات پر مشتمل ہے جن میں اکثر اردو و ہندی اور معدودے چند عربی و انگریزی سے لی گئی ہیں۔ سوائے دو چار کے باقی تمام حکایتیں ایسی ہیں جنہیں پڑھکر دماغ کو فرحت پہنچتی اور لبوں پر بے ساختہ ہنسی آتی ہے۔ دیباچہ میں تالیف کتاب کا مقصد بتایا گیا ہے کہ "جو طالب علم اسکو پڑھیں اُنکو اردو زبان دانی کا فائدہ بھی حاصل ہو اور طبیعت بھی نہ اُکتائے" باوجود ان خوبیوں کے قیمت صرف ۴ر مقرر ہے ✦

ترانۂ مسرّت

یعنی

آمدِ اقبال

اقبال کا ولایت سے بخیریت واپس آنا اہلِ دل اور اہلِ سخن کے لیے کوئی معمولی خوشی کی بات نہیں ہے۔ یہی ایک شخص ہے جس کے دم سے اُردو زبان کی اعلےٰ اصلی اور سچی شاعری کی تمام اُمیدیں آج وابستہ ہیں۔ ان کے واپس تشریف لانے سے اہلِ علم۔ اربابِ ذوق اور اصحابِ سخن میں ایک خاص مسرت پھیلی ہوئی ہے راقم عرصۂ دراز سے دنیا کے دھندوں میں اسقدر گرفتار ہے کہ شغلِ سخن سے قطعی محروم ہے مگر اقبال کی آمد کی خوشی نے انبالہ سے دہلی جاتے ہوئے ریل میں مندرجۂ ذیل چند سطریں لکھوا ہی لیں۔ یہ چند سطریں ۲۶۔ جولائی ۱۹۰۸ء کو درگاہ حضرت محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ مقام دہلی میں ایک ایسی بزم میں پڑھی گئیں جسمیں اقبال کی شمعِ کمال کے چند پروانے جمع تھے۔ اور جہاں دن بھر اقبال کی آمد کی خوشی میں بہ مہماں نوازئی حضرت خواجہ سید حسن نظامی صاحب دام فیضہٗ مہتمم توشہ خانۂ حضرت محبوبِ الٰہی بزمِ احباب منعقد رہی۔ اس بزم کے حاضرین میں سے خواجہ صاحب موصوف شیخ عبد القادر صاحب بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا۔ شیخ محمد اکرام صاحب جائنٹ ایڈیٹر "مخزن"۔ مولوی محمد عبد الراشد صاحب الخیری۔ سید جالب صاحب بخوبی خصوصیت سے [illegible]

فصلِ بہار آئی پھر گلشنِ سخن میں　　　اِک جشن ہو رہا ہے مرغانِ نغمہ زن میں
وہ مژدۂ مسرت لائی صبا چمن میں　　　پھولے نہیں سماتے پھول اپنے پیرہن میں
گلشن کے سبزپوشو جھٹ پٹ سنگار کرلو　　　عطرِ عروسِ گل دو پھولوں کے پیرہن میں

ہاں ہو نئی ادا سے سنبل کی کنگھی چوٹی
نرگس لگائے سرمہ عثمان سحر فن میں

غنچوں کو حکم دیدو دیں دادِ کجکلاہی
سیکھی ادائیں نکلیں نسرین و نسترن میں

ہر غنچہ مسکرائے ہر پھول کھلکھلائے
ہر برگ لہلہائے رونق رہے چمن میں

ہو اہتمام ایسا آرایشِ چمن کا
باقی رہے دقیقہ کوئی نہ بانکپن میں

سرو سہی سے کہدو ناچے ذرا لبِ جو
قمری ترانہ گائے جلسے اُڑے چمن میں

یوروپ کی سیر کر کے اقبال واپس آئے
خوشیاں منائیں ملکر اہل وطن - وطن میں

ہے آمدِ مسرت اقبال تیری آمد
خوشیاں ہیں اہل دل میں عیدیں ہیں انجمن میں

سر آنکھوں پر بٹھایا یوروپ میں تجکو سب نے
غربت میں بھی رہا تو گویا سدا وطن میں

پھر تیرے دم سے ہونگے تازہ سخن کے چرچے
پھر رونقیں رہیں گی یاروں کی انجمن میں

جزیرہ سسلی

ہمارے نہایت پیارے دوست ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے - پی - ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا خیر و خوبی سے بہزار کامیابی ولایت سے واپس آئے - اور آتے ہوئے مخزن اور قدر دانانِ مخزن کے لیے ایک قابل قدر تحفہ لائے - جزیرہ سسلی روئے زمین کے اُن حصوں میں سے ہے - جہاں اہل عرب نے اپنی فتوحات کا جھنڈا بلند کیا اور اپنی تہذیب کی روشنی پھیلائی - اور جو انقلاب دہر کے ہاتھوں اب اس حالت میں ہیں کہ تاریخ داں لوگوں کے سوا اور کسی کو اُن میں اسلام کی عظمت کا کوئی نشان نظر نہیں آتا - ہمارے دوست فرماتے ہیں کہ وہ رات کے وقت جہاز میں اس جزیرہ کے پاس سے گزرے اور اُسکی رنگینیوں کو دیکھکر بعض خیالات اور جذبات نے یکایک اُن کی طبیعت پر ہجوم کیا - یہ نالۂ موزوں اُن ہی خیالات اور جذبات کا نتیجہ ہے ۔

روئے اب دل کھولکر اے دیدۂ خوننابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

یہ محل خیمہ تھا ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
شعلۂ جانسوز پنہاں جنکی تلواروں میں تھے
آفرینش جن کی دنیائے کہن کی تھی اجل
جن کی ہیبت سے لرز جاتے تھے باطل کے محل
زندگی دنیا کو جن کی شورش قُم سے ملی
مخلصی انساں کو زنجیرِ توہم سے ملی

جسکے آوازے سے لذت گیر اب تک گوش ہے
وہ جرس کیا اب ہمیشہ کیلئے خاموش ہے؟

آہ! اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو
زیب تیرے خال سے رخسارِ دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے
ہو سبک چشمِ مسافر پر ترا منظر مدام
موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسن عالم سوز جس کا آتش نظارہ تھا

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر
آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

مرثیہ تیری تباہی کا مری قسمت میں تھا
یہ تڑپنا اور تڑپانا مری قسمت میں تھا

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اُس کارواں کی گرد ہوں
رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لیجاؤنگا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رُلواؤنگا

(اقبال)

مقدم برشگال

آہ! اے ساون کی جھالو! اے فضائے برشگال
آہ! اے صحرا کے نالو! اے ہوائے برشگال

اودے اودے بادلو! آغوشِ رحمت کی قسم
تھے کہاں اگلے برس تم۔ جوشِ رحمت کی قسم

تیرے اشکوں کا کہاں تھا ابرِ گریاں سلسلہ
آنسوؤں کا خلق کے تھا تا بداماں سلسلہ

یوں نہ اڑتے تھے ہوا میں گلّۂ ابرِ سیاہ
تھی زمانے کیلئے بارانِ رحمت! تیری چاہ

سبزۂ صحرا میں یہ شانِ دل آویزی نہ تھی
جوشِ بارانِ کرم میں یہ گہر ریزی نہ تھی

لالہ و گل سے تھی خالی موجِ آغوشِ زمیں
یوں نہ تھیں پھولوں کی بیلیں دوش بر دوشِ زمیں

لاجوردی تھیں نہ سبزے سے زمیں کی ڈوریاں
نیلگوں تھیں خیمۂ عرشِ بریں کی ڈوریاں

جوش پہ آئی ہوئی ساون کی اودی کالی گھٹا
تو کہاں تھی لمبے لمبے گیسوؤں والی گھٹا

تیری جھڑیاں تھیں کہاں اے ابرِ بارانِ کرم
خلق تھی تشنہ لب سرجوشِ نہانِ کرم

تجھکو اے ابرِ سیہ! امساکِ باراں کی قسم
نالہائے خلق کے دودِ پریشاں کی قسم

اے بہارِ عالمِ نیرنگِ پہنائے زمیں
تو کہاں اتنے دنوں سے آہ! تھا خلوت نشیں

تیری جھڑیوں کی ضرورت آہ! دہقانوں کو تھی
پیاس تیرے شوق کی سوکھے ہوئے دھانوں کو تھی

دیکھتے تھے راہ تیری سرو و ریحانِ چمن
تیرے مقدم کے تمنائی تھے مرغانِ چمن

لب پہ قمری کے صدائے نغمۂ دلجو نہ تھی
کنگرہ پر فاختہ کی صبحدم کوکو نہ تھی

بزمِ قدرت میں نہ تھی رعنائیِ رنگِ نشاط
بے صدا تھا تیرے غم میں سازِ آہنگِ نشاط

کھیلتی کالی گھٹائیں سبزہ زاروں میں نہ تھی
آہ! یہ عالم فریبی آبشاروں میں نہ تھی

ذرہ ذرہ آہ! وقفِ بارشِ خوناب تھا
قطرہ قطرہ آہ! تیرا گوہرِ نایاب تھا

قحط کا بارِ گراں تھا بارِ عصیاں دوش پر
بارے آیا۔ شکر ہے۔ دریائے رحمت جوش پر

پھر سُہانی رُت تری اے ابرِ باراں آگئی
ٹھنڈی ٹھنڈی مینہہ کی پھر لیکے جھڑیاں آگئی

ڈالدی پھر تُو نے دہقانوں کے ارمانوں میں جان
پڑ گئی قدرت کے پھر زرخیز میدانوں میں جان

تنگ تھی شدّتِ امساکِ باراں سے مُحال
تیرے آنے سے ہوئی ابرِ کرم! خلقت نِہال

پھر نکالیں کونپلیں۔ پھر روپ پر آئے شجر
پھر چمن کا رنگ بدلا۔ پھر نکھر آئے شجر

لوٹتا ہے دل۔ ادائے سبزۂ کہسار پر
کردیا قدرت نے مینا وادیٔ پُرخار پر

لاکھ جانیں تیرے صدقے! ابرِ نیسانِ کرم
ڈال دی مٹی میں تُو نے جان بارانِ کرم

سرور جہان آبادی

برسات

غُربت میں اب [illegible]ے ہیں پھر دن بہار کے
قدرت نے پھینکا جامۂ کہنہ اُتار کے

پھر رنگ ڈھنگ بدلے ہیں لیل و نہار کے
پھر آئے دن بہار کے اور پھر نکھار کے

صحرا و باغ و راغ کے مقسوم کُھل گئے
اب لطف دیکھنا کوئی دن میں کچھار کے

دشت و جبل میں فرشِ زُمرّد ہوا تمام
منظر عجیب ہو گئے قرب و جوار کے

جوبن پہ ان دنوں ہے عروسِ چمن کا رنگ
قرباں ہیں آن بان کے اور اس سنگار کے

صحنِ چمن سے اب اُٹھائے کوئی ہمیں
ہونگے یہیں نشان ہمارے مزار کے

کوئل کی کُوکُو اور پپیہے کی پی کہاں!
نالے سُنائی دینے لگے پھر ہزار کے

کس درجہ دلفریب ہے طاؤس کی صدا
جنگل تمام سر پہ اُٹھایا پکار کے

چمکی گھٹا میں بجلی تو جی لوٹ ہو گیا
انداز یاد آئے کسی گلعذار کے

فصلِ بہار آتے ہی فرقت ہوئی نصیب
دن تھے یہی تو لطف کے ملنے کے یار کے

او شادکام ہستیٔ ناپائدارِ زیست
ہم دل جلوں سے پوچھ مزے اس بہار کے

ناکام آرزو ہوں میں، حرماں نصیب ہوں — مطرب سنائے جب مجھے نغمے ملار کے
برباد گر کیا ہے فلک نے تو یہ بھی ہو — رُٹھ جائیں دل سے نقش محبت کے پیار کے
ناشاد غم نے زیست سے بیزار کر دیا — اب ہم ہیں اور قدم شہِ دُلدل سوار کے

ناشاد

عالمِ نزع

نزع کا حال نہ پوچھ اے ہمدم — کیا بتاؤں کہ ہے کیسا عالم
ہوتی جاتی ہے جہاں سے دُوری — اُف رے یہ بے کسی و مجبوری
بے وفا روح یہ کیا تجھکو ہُوا — عمر بھر کا تھا ہمارا ساتھ ترا
آج سختی ہے یہ مجھ سے تیری — ٹوٹی جاتی ہے ہر اک رگ میری
ختم ہیں طولِ امل کی باتیں — اب نہ وہ دن ہیں نہیں وہ راتیں
آج ہوتی ہے وداعِ مہماں — روح کرتی ہے سفر کا ساماں
جھلملاتا ہے چراغِ دنیا — اب لیے جاتا ہوں داغِ دنیا
فاش ہوتا ہے یہ رازِ ہستی — بے صدا ہوتا ہے سازِ ہستی
ہو گیا آئینہ حالِ دنیا — آج سُوجھا ہے مآلِ دنیا
وقت اب وہ ہے کہ مختل ہیں حواس — عقل بیکار معطل ہیں حواس
ہے نگاہوں کی عجب کیفیت — کس قیامت کی بھری ہے حسرت
شکل موہوم ہے یہ دارِ خراب — سب طلسمات جہاں نقش بر آب
سیمیا ہے یہ نمودِ دنیا — شعبدہ ہے یہ نمودِ دنیا
عبرت آگیں ہے بہارِ ہستی — کیا ہے یہ نقش و نگارِ ہستی
قصر ہیں وہ نہ طلائی ایواں — کیا بتاؤں کہ یہ کیسا تھا سماں

چاندنی ہے نہ وہ حسرتؔ دل کی — نہ ہوا ہے نہ وہ فرحت دل کی
نہ وہ گلگشت رہی اور نہ چمن — نہ وہ بلبل ہے نہ وہ بوئے سمن
نہ شجر ہیں نہ گل تازہ و تر — نخلِ تابوت ہے اب پیشِ نظر
نہ وہ نہریں ہیں نہ وہ فوارے — نہ فلک ہے نہ فلک پر تارے
نہ وہ سیارو ثوابت کا نظام — نہ وہ گردش نہ وہ دورِ ایام
نہ عناصر کا زمانے میں پتا — آب و آتش ہے نہ ہی خاک و ہوا
نہ ہے حیوان کوئی اور نہ زمیں — نہ جمادات و نباتات کہیں
اب کہاں نفس نباتی کا اثر — اب کہاں نامیہ اور برگ و ثمر
مہر و مہ میں نہ بروجِ افلاک — نہ وہ ذرّے ہیں نہ وہ طبقۂ خاک
نہ وہ لشکر نہ حصارِ سنگیں — نہ عمارات نہ وہ حصنِ حصیں
نہ اقالیم و ربع مسکوں — نہ سمندر ہی نہ آبِ جیحوں
ہفت جوش اب نہ معادن میں کہیں — نہ فلزّات و جواہر ہیں کہیں
نہ وہ دریا ہیں نہ وہ دشت و جبال — نہ وہ فصلیں ہیں نہ ہیں وہ مہ و سال
نہ وہ صحرائے پر از ہول و خطر — نہ ہے وہ ذوق تماشائے نظر
وہ فضا ہے نہ وہ چٹیل میدان — وہ مناظر ہیں نہ وہ ساماں
روشیں ہیں نہ ہیں اب وہ گلزار — نہ وہ گنجان درختوں کی بہار
نہ وہ دل ہے نہ تماشا طلبی — نہ جزر ہے نہ وہ فخرِ نسبی
نہ وہ ہم ہیں نہ وہ اسبابِ نشاط — نہ وہ محفل ہی نہ اربابِ نشاط
نہ کلیسا ہے نہ بت خانہ ہے — نہ کہیں محفلِ رندانہ ہے
ب نہ وہ منطق ارباب کمال — نہ وہ صوفی ہیں نہ وہ صحبتِ حال
حافظہ ہے نہ تصوّر ہے کہیں — واہمہ ہے نہ تخیّل ہے کہیں

ہجر ہے اب نہ وہ فریاد کا غل — رات ہے اور نہ خیالِ کاکل
نہ وہ کس بل ہے نہ وہ زورِ شباب — عشق ہے اور نہ دلِ خانہ خراب
اب نہ پہلو میں بُتِ نوآئیں — اب نہ وہ شب ہے نہ خوابِ نوشیں
جستجوئے دلِ گم گشتہ کہاں — اب نہ میں خود ہوں نہ اُس دل کا نشاں
زندگی تک تھی مری شانِ وفا — اب وفا ہے نہ وہ پیمانِ وفا
نہ خیال اب دلِ سودائی کا — نہ میں قائل ہوں مسیحائی کا
کوچہ گردی ہے نہ وہ جوشِ جنوں — اب نہ رگ رگ میں ہے وہ گردشِ خوں
ہوں نہ خمیازہ کشِ لذتِ دید — نہ سمجھتا ہوں میں نظارۂ عید
دل جو اک وحشیِ رم خوردہ تھا — کیا عجب پاس ہمارے ہو گا
میں کہاں اور کہاں طولِ امل — اب تو ہے فکرِ مکافاتِ عمل
اپنی حالت پہ میں روؤں کیونکر — اپنی غفلت پہ میں روؤں کیونکر
میں ہوں اور عاقبتِ کار کی فکر — گوشۂ تارِ لحد کے کچھ ذکر
دیکھیے دیکھیے ہے کیا ہونا — ہے مجھے جان کا اپنی رونا

کچھ یونہی سا مجھے آتا تھا نظر
دیکھتا تھا یہ طلسمی منظر

دفعتہً نور ہوا سب زائل — اک حجاب آ کے ہوا ہے حائل
سب یہ نقشہ مری آنکھوں سے چھپا — پردۂ عالمِ تصویر اُٹھا
ہیچ تھے ہیچ تھے سب یہ ساماں — ہم نہیں جب تو ہے کیا خاک جہاں
دیکھ لو دیکھنے والو صورت — آج تو میں ہمہ تن ہوں عبرت
محفلِ عیش ہے درہم برہم — اب ہے آرائشِ بزمِ ماتم
گھیرے بیٹھے ہیں احبا سارے — روتے جاتے ہیں اعزا سارے

اب دعاؤں کی فراوانی ہے — مشغلہ سب کا مگس رانی ہے
دیکھتے جاتے ہیں صورت میری — زیرِ تجویز ہے تُربت میری
شورِ گریہ مرے سر پر ہے بپا — ایک ہنگامۂ محشر ہے بپا
غور سے دیکھ ذرا اے غافل — زورِ تدبیر یہیں ہے باطل
سر بالیں ہے ہجومِ حسرت — دم بخود چارہ گروں کی صحبت
ہیں اسی فکر میں احباب اکثر — ڈوبیں نبضیں مری اُبھریں کیونکر
کھولا جاتا ہے وصیت نامہ — کوئی لکھتا ہے شہادت نامہ
فکرِ کافور و کفن میں کوئی — نالہ کش بیتِ حزن میں کوئی
کوئی کہتا ہے بصد آہ و فغاں — اِسکی مشکل ہو الٰہی آساں
روح کا قول ہے یہ وقتِ اخیر — خوابِ ہستی کی یہی ہے تعبیر
پوچھتے کیا ہو مرا حالِ خراب — میں ہوں اور داغِ فراقِ احباب
سر بالیں ہے مرے اِک صحبت — دیکھوں کس طرح میں سب کی صورت
نور تھا آنکھ میں اب وہ بھی نہیں — زلفِ آراستہ کھلتی ہے کہیں
کہہ دو زلفوں کو نہ کھولیں للّٰہ — میری نظروں میں زمانہ ہے سیاہ
شرحِ بے ربطیٔ اجزائے حواس — اب نگاہوں سے مری کرے قیاس
دامنِ اشکوں سے بھگونیوالے — اے مرے حال پہ رونیوالے
کیا کیا میں نے بتاؤں کیونکر — سرگزشت اپنی سناؤں کیونکر

قوتِ نُطق گئی سب میری
بند ہوتی ہے زباں اب میری

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

تازہ غزلیں

دخل ہے ہر دل میں اب تک ذوقِ غم پیچیدہ ہے
مبتلا ہے عین دریا میں مگر نم دیدہ ہے

دیجئے کس چیز سے تشبیہ تیرے حسن کو
ایک تو ہی دیدہ ہے تیرے سوا نادیدہ ہے

بے حجابی یہ کہ ہر صورت میں جلوہ آشکا
گھونگھٹ اُس پر یہ کہ صورت آجتک نادیدہ ہے

فتنہ زارِ حشر سب سمجھے تھے تیرے حسن کو
دامنِ تارِ نگہ کا گوشہ جنبیدہ ہے

حشر میں مُنہ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے
آسیؔ گستاخ کا ہر جرم نابخشیدہ ہے

آسی

مانا تمام خلق سے تو بے نیاز ہے
تیرا نیازمند ہوں یہ مجھکو ناز ہے

اُٹھ جائے بزمِ مے سے جو بے امتیاز ہے
خلوت پسند صحبتِ افشائے راز ہے

تیرے فقیر دولتِ طاعت سے ہیں غنی
داغِ سجود درہمِ اہلِ [illegible] ہے

شاید یہ نردبان ہو بامِ وصال کا
عالم تمام کوہِ نشیب و فراز ہے

سرمایۂ غنا ہے ترقیِ احتیاج
جو فقر میں فنا ہو وہی بے نیاز ہے

وہ محوِ رنگ خندہ ہے یہ محوِ ذاتِ گل
بلبل میں اور غنچہ میں یہ امتیاز ہے

کیوں سدِّ راہِ میکدہ ہوتا ہے محتسب
پوچھو کہ شب ہے کہ درِ توبہ باز ہے

تکلیف ہے وطن میں زیادہ سفر میں کم
نکلو تو عینِ راہ میں قصرِ نماز ہے

قائل ہو نیک و بد میں تجلیِ حسن کا
کاشف کی کیا سند کہ وہ بے امتیاز ہے

کاشف غازیپوری

رکھنا خمِ گیسو میں یا دل کو رہا کرنا
کچھ کہہ تو سہی ظالم آخر تجھے کیا کرنا

آتا ہے سوا اسکے اور آپکو کیا کرنا
اپنوں کو بُرا کہنا غیروں کا بھلا کرنا

مجھ سے ہی جدا رہنا مجھکو ہی جدا کرنا
پھر اُس پہ یہ طرّہ ہے میرا ہی گلا کرنا

اب قتل مجھے کرنا۔ یا عفوِ خطا کرنا
منظور ہی جو کرنا پھر سوچ ہی کیا کرنا

آئینہ میں عکس اپنا دیکھا تو کہا مجھ سے
دونوں میں ہی کون اچھا انصاف ذرا کرنا

بوسہ بھی مجھے دینا۔ ہونٹوں میں ہی کچھ کہنا
جینے کی دوا دینا۔ مرنے کی دعا کرنا

دل تو نہ مرا توڑو۔ وعدہ تو ذرا کر لو
چاہو تو وفا کرنا۔ چاہو نہ وفا کرنا

کیوں ہوتے ہو ہے میری اوروں سے غرض رکھو
مجھ پر ہی ستم ڈھانا۔ مجھ سے ہی جفا کرنا

ہم سے بھی عہد تھے۔ ہم سے بھی پیماں تھے
یوں ملکے دغا دینا یوں ملکے دغا کرنا

کیا مجھ سے زیادہ ہے پابندِ وفا کوئی
ایمان سے تم کہنا۔ انصاف ذرا کرنا

جلتے ہو جو گھر جاؤ پر وعدہ یہ کر جاؤ
میں یاد جب آ جاؤں مرنیکی دعا کرنا

ہے غیر کے ماتم میں یہ آہ و فغاں ناحق
اب مجھ پہ کرم کرنا۔ اب مجھ سے وفا کرنا

رک رک کے یہ ملنا کیا مل مل کے یہ رکنا کیا
کیوں کھل کے نہیں کہتے آخر تمہیں کیا کرنا

ہے ہم جو کھنچ بیٹھے قسمت کی یہ خوبی ہے
بیکار ہے غم کھانا۔ بیجا ہے گلا کرنا

انکو ہی ادھر یہ ہٹ پامال کریں اسکو
دل کو ہی ادھر یہ ضد۔ ان کا ہی کہا کرنا

میں وہ کہ مجھے مشکل دل دیکے جو پھر مانگوں
تم وہ کہ تمہیں آساں دل لیکے دغا کرنا

ترچھی تری چتون نے لاکھوں ہی کیے بسمل
اے ترک ترا ناوک کیا جانے خطا کرنا

دل تمکو یونہیں دینگے کیا عہدِ وفا لینگے
تم جور و جفا کرنا یا مہر و وفا کرنا

ہے وصل کی شب تمکو افسوس حجاب اتنا
کس شرع میں جائز ہے خلوت میں حیا کرنا

صیاد مرا یار سب پھندے میں پھنسا کر کے
ہر ایک سے کہتا ہے اب چاہیے کیا کرنا

یاں وعدہ وفا ہوگا یا حشر پہ رکھوگے
میں بھی تو سنوں تمکو منظور ہے کیا کرنا

دشوار ہے آنا ہی دل کا مجھے سمجھانا
جتنا تمہیں مشکل ہے وعدے کا وفا کرنا

نعش اٹھتی ہے دشمن کی آؤ اسے مٹی دے
پھر آہ کیا کرنا۔ پھر ہاتھ ملا کرنا

سہتے ہیں جفا انکی کرتے ہی وفا ان سے
دلکی ہی خوشی کرنی انکا ہی کہا کرنا

قربان میں عصیاں کے بخشش کی ملی دولت ÷ صد شکر کہ محشر میں کام آیا خطا کرنا ÷ بیداد کا اب شکوہ بیجا ہے نسیم ان سے ÷ تھا تم کو محبت کا اظہار ہی کیا کرنا ÷ (نسیم بھرتپوری)